کے دوران آپ یہ بھی ثابت کرتے جاتے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہر نوع اکمل ہیں۔"[۳]

۲

میاں شاہ دین ہمایوںؔ نئی طرزِ شاعری کے دلداہ تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد سے تو باقاعدگی کے ساتھ نظمیں کہنے لگے تھے اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ اُن کی تحریک پر احمد حسین خاں اور مدن گوپال نے ایک لٹریری سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور انارکلی بازار کے شروع میں ایک مقام منتخب کر کے نظموں کے مشاعروں کا منصوبہ بنایا۔ پہلے مشاعرے کا عنوان تجویز ہوا 'ہمالہ'۔[۴]

اتفاق سے سوامی رام تیرتھ ہمالہ کی گھاٹیوں میں سنیاس لے کر واپس آئے تھے۔[۵] ہمالہ کی فضا اور قدرتی مناظر اُن کی رُوح میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ گھنٹوں اقبال کے پاس بیٹھے ہمالہ کا نقشہ کھینچتے رہتے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس معلومات نے اقبال کو نظم کے لیے کافی مواد فراہم کیا۔ خود اُنہوں نے پہاڑ نہ دیکھے تھے مگر سوامی کی سیر یوں ہی تھی جیسے اقبال خود ہمالہ کی گھاٹیوں سے ہو آئے ہوں۔ باقی کسر پوری کرنے کے لیے تخیل بہت تھا۔

نظم ہو گئی مگر اقبال اُس کی بندش سے مطمئن نہ تھے۔ نظرِ ثانی کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی چنانچہ اگلے بائیس تیئیس برس تک اِس نظم کی جو صورت لوگوں کے سامنے رہی وہ حتمی نہ تھی بلکہ نظرِ ثانی کی محتاج تھی البتہ اُس متن میں بھی دو نکات خاص طور پر توجہ کے قابل تھے۔

اقبال اب تک خوبصورت مناظر کو کشمیر سے منسوب کرتے رہے تھے مگر اِس نظم میں کشمیر کا ذکر نہیں کیا اگرچہ موقع موجود تھا۔ اس کی بجائے ہمالہ کو "دیوارِ ہندوستاں" کہا اور اِسی حوالے سے اپنا پاسباں قرار دیا۔ یہ تصور اُن کی شاعری کا مستقل موضوع بن کر کئی مراحل سے گزرا۔

اِس کے علاوہ بدھ مذہب کی تعریف کرتے ہوئے اُنہیں "نفیِ ہستی" کی اصطلاح استعمال کرنی پڑی تھی۔ مادی دنیا سے بلند ہو کر روح کے ذریعے اپنی ذات کو وسیع کرنے کے لیے روایتی طور پر اسی قسم کے تصورات رائج تھے لیکن اگر تاریخی حقیقت کو فلسفیانہ خیالات کی کسوٹی سمجھا جائے تو اُس زمانے کے حقائق اِس روایتی تصور میں ترمیم کا تقاضا کر رہے تھے جس سے اقبال بے خبر نہ تھے۔ مادی سطح سے بلند ہوئے بغیر شخصیت کی تعمیر ممکن نہیں اور اِس کے لیے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

کسی نہ کسی صورت میں اپنی ہستی کو مٹانا بھی پڑتا ہے مگر کیا اِسے نفیِ ہستی کہنا مناسب ہوگا؟ اقبال کو کسی متبادل تصور کی تلاش تھی جو مشرق میں موجود تھا نہ مغرب میں۔

اِس کے علاوہ نظم میں بعض مقامات ایسے تھے جو ادبی اعتبار سے اقبال کو کھٹکتے ہوں گے مثلاً ایک جگہ انہوں نے ہمالہ کے دامن میں بہتی ندی کے بارے میں کہا تھا، ''کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی۔'' یہ مصرع کہنے کا جواز تب ہو کہ شاعر نے کوثر و تسنیم کا لہرانا اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہو چنانچہ اِس قسم کے مقامات پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت تھی۔

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ پہ کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں
تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیّر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایّام پر
امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تُو
پاسباں اپنا ہے تُو، دیوارِ ہندوستاں ہے تُو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تُو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تُو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر
سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موجزن
رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتوفگن
چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رُومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ! کوئی بازی گاہ ہے تُو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا جوشِ مسرّت میں اُڑا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے کیا مزے لے لے کے ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے کہتی ہے اِس کی خامشی
دستِ گل چیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کُنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی
ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی
چھیڑتا جا اِس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیِ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

وہ اُچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اِک نور کی
جھانکتا ہے وہ درختوں کے پرے خورشید بھی
دل لگی کرتی ہے ہر پتّے سے جس کی روشنی
میرے کانوں میں صدا آئی مگر کچھ اور ہی

دل کی تاریکی میں وہ خورشیدِ جاں افروز ہے
شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیااندوز ہے

وہ اصولِ حق نمائے نفیِ ہستی کی صدا
رُوح کو ملتی ہے جس سے لذّتِ آبِ بقا
جس سے پردہ رُوئے قانونِ محبت کا اُٹھا
جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا

تیرے دامن کی ہواؤں سے اُگا تھا یہ شجر
بیخ جس کی ہند میں ہے چین و جاپاں میں ثمر

تُو تو ہے مدت سے اپنی سرزمیں کا آشنا
کچھ بتا اُن رازدانانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا
تیرے ہر ذرے میں ہے کوہِ المپس کی فضا

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

آنکھ اے دل کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ
اِس فضا کو اِس گل و گلزار کی نکہت کو دیکھ
اپنی پستی دیکھ اور اِس کوہ کی رفعت کو دیکھ
اِس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاہدِ مطلب ملے جس سے وہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے وہ درماں ہے یہی[۶]

۳

مشاعرے میں احمد حسین بھی اپنی ہمالہ لائے تھے مگر اس دفعہ اقبال نے میدان مار لیا۔

اقبال کی نظم میں ہر چیز متحرک تھی اور ایک نغمگی کے ساتھ زندگی کے راستے پر رواں دواں تھی جس کی وجہ سے لگتا تھا کہ شاید گزری ہوئی زندگی کا ماجرا سنانے کے لیے ہمالہ بھی سچ مچ بول اُٹھے گی یا وقت کی گردش بھی دوبارہ پیچھے کی طرف دوڑنے لگے گی۔ اقبال مدت سے جس اسلوب کی تمنا کر رہے تھے وہ اب اُن کی گرفت میں تھا۔

۴

بہت سے ہندوستانی افریقہ کے ممالک مثلاً جنوبی افریقہ وغیرہ میں کام کرنے جاتے تھے جہاں برطانوی سرمایہ دار مقامی لوگوں کو تہذیب سکھا رہے تھے اور اُن کا سونا چاندی انگلستان بھیج رہے تھے۔ اقبال نے ایک پنجابی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

مزدور کا تصور کیا جو ڈربن کے ساحل پر خواب میں راوی کے کنارے اپنا ٹوٹا ہوا گھر دیکھ رہا تھا:

جہاں محنت ہم آغوشِ کفایت ہو کے رہتی تھی
قناعت خانہ پرورِ محبت ہو کے رہتی تھی

جہاں چرخے کی خواب آور صدا پردہ تھی آہوں کا

'مزدور کا خواب' میں ہیئت کا تجربہ کر رہے تھے یعنی مثنوی کی طرز پر دو تین اشعار کے بعد بند کا اختتام کسی شعر کی بجائے تنہا مصرعے پر ہوتا تھا۔ تیسرے بند سے آگے نہ لکھا گیا اور تجربہ ادھورا رہا۔[۷]

۵

پچاس برس سے زیادہ عرصے سے ملکہ وکٹوریہ انگلستان پر حکومت کر رہی تھی اور ہندوستان والے تو اُن کے بغیر انگریز کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پچھلی صدی میں غدر کے بعد جب کمپنی کے ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا تھا تو ملکہ وکٹوریہ ہی کے فرمانِ عالی سے رعایا نے جان و مال کی امان حاصل کی تھی۔

۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو عید الفطر تھی۔ تار کے ذریعے یہ خبر پہلے لندن سے کلکتے اور پھر پورے ہندوستان میں پھیل گئی کہ ملکہ وکٹوریہ انتقال کر گئی ہیں۔

۶

تقریباً چار سال پہلے مسلمانوں کی طرف سے ملکہ وکٹوریہ کو سپاس نامہ پیش کرنے کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے میر حسن نے کہا تھا کہ یہ ایسا شاندار ہو جس سے معلوم ہو جائے کہ کل کی فاتح قوم نے آج کی ملکہ کو پیش کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی جذبہ اقبال کے دل میں کارفرما دکھائی دیتا ہے جب وہ ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ لکھ رہے تھے جسے صرف دو تین روز بعد مسلمانوں کی طرف سے ایک تعزیتی جلسے میں پڑھا جانا تھا۔

یہ تجربہ اُن کی تخلیقی صلاحیت کو ایک انوکھی انتہا پر لے گیا۔ آخر اُس قوم کے فرزند تھے جس نے تاج محل بنایا تھا۔ اب وہ وسائل نہ سہی مگر ایسی نظم ضرور تعمیر کر سکتے تھے جو دُنیا بھر کے تعزیتی پیغامات میں ممتاز دکھائی دے:

ماتم میں آ رہے ہیں یہ ساماں کیے ہوئے
داغِ جگر کو شمعِ شبستاں کیے ہوئے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

برطانیہ تُو آج گلے مل کے ہم سے رو
سامانِ بحر ریزیِ طوفاں کیے ہوئے[۸]

نظم ترکیب بند تھی جس میں دس بند تھے اور ہر ایک میں گیارہ اشعار۔ ہر بند میں یکساں تعدادِ اشعار نے نظم کی ظاہری صورت میں ایک شان پیدا کر دی۔ یہ نسخہ اقبال نے بعد میں اپنی مشہور ترین نظموں میں شان و شکوہ پیدا کرنے کے لیے کئی دفعہ استعمال کیا۔[۹]

ملکہ وکٹوریہ کا انتقال عید کے دن ہوا چنانچہ اقبال نے ہلالِ عید سے خطاب کر کے ایک طرف اُسے وہ خاص تعلق یاد دلایا جو اُسے اُن کی قوم کے ساتھ تھا مثلاً مسلمانوں کا قومی نشان تھا۔ دوسری طرف موجودہ صورتحال کی مناسبت سے خوشی کے چاند سے غم کی بات کہہ دی اور اُس کی خنجر جیسی شکل پر خاص توجہ دی۔ یہ اقبال کی بعد کی شاعری کے مستقل موضوعات ہیں جن کی ابتدا اِسی نظم میں ہوتی ہے:

ایمن تھے غم سے ہم مگر اے خنجرِ ستم
کرنے تھے ذبح طائرِ بامِ حرم تجھے

عید کو غم کا موقع سمجھنے کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات ہوئی تھی مگر اِس پردے میں مسلمانوں کی موجودہ پستی کا غم بھی سمٹ گیا۔ انگریز ملکہ کے سوگ کے کچھ استعارے نظم سے الگ کر لیے جائیں تو خود مسلمانوں کی حکومت جانے کا ماتم بن جاتے ہیں اور اقبال کے اولین سامع یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہے ہوں گے:

پژمردہ ہو گیا گلِ بستانِ افسری
خوں رو رہی ہے باغِ جہاں میں بہار آج

ملکہ کی تعریف میں لفاظی کم تھی اور حقیقتاً اُس زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کے بارے میں جو خیالات عام طور پر ظاہر کیے جاتے تھے اُنہیں زیادہ استعمال کیا جس کی وجہ سے یہ نظم وکٹورین عہد کی ایک تاثراتی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال کی نظر صرف ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ انگلستان پر بھی تھی اور اُن کی آگہی حیرت انگیز ہے۔ مثلاً چار برس پہلے گولڈن جوبلی پر ملکہ کی سواری لندن سے گزری تو عمارتوں پر آویزاں بینروں میں سب سے بڑے پر لکھا تھا:[۱۰]

Our Hearts Thy Throne! The Queen of Earthly Queens

اقبال نے یہی بات اپنی نظم میں بیان کر دی تھی:

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تُو جس کی تخت گاہ تھی اے تخت گاہِ دل!
رخصت ہوئی جہان سے وہ تاج دار آج

اِس کے علاوہ:

اے بحر! حکمراں جو زمینوں کی تھی گئی
آغوش موج جس کے سفینوں کی تھی گئی

ایک اچھے حکمراں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اقبال نے وہ بنیادی خصوصیات گنوادیں جواُن کے خیال میں اور شبلی نعمانی کے حساب سے مسلمان بادشاہوں میں ہوا کرتی تھیں:

فرماں نہ ہو دِلوں پہ تو شانِ شہی نہیں
سونے کا تاج کوئی نشانِ شہی نہیں

تعزیت کے موقع پر ان خصوصیات کو اعزازی طور پر ملکہ وکٹوریہ سے منسوب کر دینے سے ظاہر تھا کہ تعزیت کرنے والی قوم خود بھی آدابِ جہانبانی سے ناواقف نہیں ہے:

شاہی یہ ہے کہ اور کا غم چشمِ تر میں ہو
شاہنشہی یہ شانِ غریبی نظر میں ہو

یہ کہنا مشکل ہے کہ اقبال ملکہ وکٹوریہ میں یہ تمام خوبیاں موجود ہی تھیں مگر اقبال کے اپنے تخیل کی ایک گرہ ضرور کھُل رہی تھی۔ فقر اور شاہی کے امتزاج کی پہلی جھلک یہیں دکھائی دیتی ہے۔

اِس سے پہلے اقبال عام طور پر کشمیر کو جنت اور گلشن کہا کرتے تھے۔ اِس نظم میں پہلی بار ہندوستان کے لیے باغ کا لفظ ملتا ہے۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع بن گیا جسے بعد میں اقبال نے مشہور اشعار میں استعمال کیا۔ اِس کے علاوہ نظم میں شان و شکوہ کے ساتھ ساتھ دیگر شعری محاسن بھی موجود تھے۔ چونکہ یہ کسی ذاتی دوست کا مرثیہ نہیں بلکہ ایک قوم کی طرف سے رسمی تعزیت نامہ تھا لہٰذا پر تکلف خیال آفرینی کا موقع بھی تھا جسے خوب استعمال کیا۔

اشکِ خوں

(آخری بند)

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

پیغامِ خانہ سوزیِ دل بار بار دے
فرصت نہ دو گھڑی نفسِ شعلہ بار دے
زورِ جنوں میں جائے جو دشتِ عدم کو دل
پہلے قدم پہ جامۂ ہستی اُتار دے
پھونکا ہے غم کی آگ نے جانِ نزار کو
ہم کو تسلّیاں دلِ آشفتہ کار دے
جس کا دِلوں پہ راج ہو مرتا نہیں کبھی
صدیاں ہزار گردشِ دَوراں گزار دے
رہتا ہے دل میں صورتِ حرفِ نگیں وہ نام
شہرت جسے جہان میں پروردگار دے
وکٹوریہ نہ مُرد کہ نامِ نکو گذاشت
ہے زندگی یہی، جسے پروردگار دے
اے غم کشانِ دُودۂ شاہی خدا تمھیں
اِس دردِ جاں گزا میں شکیب و قرار دے
رفتار اُس کے نقشِ قدم پر کرے نصیب
یہ مہرِ مادری کی تمھیں یادگار دے
اے باغِ ہند! تیرا خیاباں بجائے گل
موتی مثالِ دامنِ ابرِ بہار دے
پژمردہ کر گئی ہے جو بادِ خزاں تجھے
صد نوبہارِ ناز تجھے روزگار دے
مرحوم کے نصیب ثوابِ جزیل ہو
ہاتھوں میں اپنے دامنِ صبرِ جمیل ہو"

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ماتمی جلسہ ۲۳ یا ۲۴ جنوری کو ہوا۔ خیال ہے کہ اقبال نے پوری دس بند کی نظم اِس موقع تک تیار کر لی تھی اور بہت پسند کی گئی۔ لاہور میں مطبع خادم التعلیم سے بھی شائع ہوئی اور مطبع مفیدِ عام سے بھی جس کے سرورق پر درج تھا، ''اشکِ خوں یعنی ترکیب بند جو حضور ملکۂ معظّمہ مرحومہ کے انتقالِ پرملال پر مسلمانانِ لاہور کے ایک ماتمی جلسہ میں پڑھا گیا از خاکسار اقبال''۔[۲] انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا جس کے بارے میں خیال ہے کہ اقبال نے خود ہی کیا تھا۔

۷

اگلے ہی مہینے انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اقبال نے جو نظم لکھی اُس کا عنوان تھا 'دردِ دل یا ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'۔ پچھلی نظم 'اشکِ خوں' کی طرح یہ بھی ترکیب بند بھی اور ہر بند میں اشعار کی تعداد برابر تھی۔ کل پندرہ بند تھے اور ہر بند میں دس اشعار تھے۔

پچھلی نظم کی طرح اِس میں بھی ہلالِ عید کو مخاطب کر کے خوشی کی بجائے غم کی باتیں کہی گئی تھیں۔ ملکہ وکٹوریہ کی وفات نے برطانوی ہند کو سرکاری طور پر یتیم کر دیا تھا مگر نظم میں جو بچہ خطاب کر رہا تھا وہ سچ مچ یتیم تھا۔ یہ موضوع اُس برس کے جلسے کے لیے بڑا مناسب تھا۔

یتیم کے غم کو بیان کرنے میں ایسے اشعار بھی کہے گئے تھے جو بیساختگی اور جذبات کے خلوص کی وجہ سے یتیم کے علاوہ کسی بھی شخص کے جذبات کی آئینہ داری کر سکتے تھے مثلاً:

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہوں میں
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں

پھر جہاں یتیم بچے نے خاص طور پر اپنی کیفیت بیان کی تھی وہاں وہ صرف بیچارگی کی تصویر نہیں رہتا تھا جسے چند سکّے خیرات دے کر نظروں کے سامنے سے ہٹا دیا جائے بلکہ اُس کے غم ایسے تھے جو اُسے ایک شخصیت عطا کرتے تھے اور سننے والا اُس کے کرب کے ساتھ اُس کی معصومیت کو محسوس کر کے اُس کے جذبات میں حصہ دار بن جاتا تھا:

کھیل میں آ گئی جو چوٹ کبھی
کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے؟
کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے؟

'نالہ یتیم' کی طرح یہ نظم بھی نعتیہ پہلو لیے ہوئے تھی۔ تیرہویں بند میں بچہ اپنے تصور میں داستانِ عرب سن کر بیخود ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے دونوں بند قوم کے ساتھ عشق، محبت اور رازداری کے رشتے کی تصویر کھینچتے تھے۔ قوم اور بیخودی کے تصورات کا عشقِ رسولؐ کے ذریعے امتزاج ہی بعد میں اقبال کی فکر کی اَساس بنا۔ یہ اُس کی پہلی واضح جھلک تھی۔

دردِ دل

یعنی یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

(بند ۱۳، ۱۴، ۱۵)

طعن دیتا ہے کس بلا کے مجھے
آسماں بن گیا ستا کے مجھے
ہائے بیخود کیا تصوّر نے
داستانِ عرب سنا کے مجھے
ہے تصدّق مری یتیمی پر
کوئی نقشہ دکھا دکھا کے مجھے
چاہیے اے خیال! پاسِ ادب
تُو کہاں لے گیا اُڑا کے مجھے!
ہائے اے آتشِ فراقِ پدر!
خاک کر دے جلا جلا کے مجھے
اے یتیمی! فتادگی بن کر
چھوڑنا خاک میں ملا کے مجھے
لبِ اظہار وا ہوا نہ کبھی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

غم نے دیکھا ہے آزما کے مجھے
پردہ رکھ لے شکستہ پائی کا
کارواں لے چلے اُٹھا کے مجھے
زندگی کیا اِسی کو کہتے ہیں
کہ مزے مل گئے فنا کے مجھے

عرش ہلتا ہے جب یہ روتے ہیں
کیا یتیموں کے اشک ہوتے ہیں!

کیا ہنسی ضبط کی اُڑاتے ہیں
اشک آ آ کے چھیڑ جاتے ہیں
اِک بہانہ ہلالِ عید کا ہے
قوم کو حالِ دل سناتے ہیں
کس مزے کی ہے داستاں اپنی
قوم سنتی ہے ہم سناتے ہیں
دیکھ اے زندگی! مرے آنسو
یہ ترے نقش کو مٹاتے ہیں
ہاں بتا اے فلک! کہ طفلی میں
درد کو کس طرح چھپاتے ہیں؟
خاک راہِ فنا میں اُڑتی ہے
منہ کفن میں چھپائے جاتے ہیں
وہ بھی ہوتے ہیں اے خدا! کوئی
جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں
اِس طرح کی ہے داستاں اپنی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ہے عیاں جس قدر چھپاتے ہیں
ہم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے
یہ قیامت کے دُکھ اٹھاتے ہیں

آبرو بڑھ گئی خموشی کی
یہ زباں بن گئی یتیمی کی

رنگِ گلشن جو ہو خزاں کے لیے
قہر ہوتا ہے باغباں کے لیے
چاہیے پاس برق کا اے دل!
ہو خسِ خشک آشیاں کے لیے
اُڑ کے آتا ہے رنگِ عارضِ زرد
کس مصیبت کی داستاں کے لیے!
حال دل کا سنا دیا سارا
کچھ بھی رکھا نہ رازداں کے لیے
ہے اقامت طلب جدار مری
قوم ہو خضر اِس مکاں کے لیے
ہاتھ اے قومِ مہرباں! تیرا
ابر ہے کس کے گلستاں کے لیے؟
حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں
اور رکھیں اِسے کہاں کے لیے!
صورتِ شمعِ خانۂ مفلس
خامشی ہے مری زباں کے لیے
اب مگر ضبط کا نہیں یارا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

سب ترسنے لگے فغاں کے لیے
دردمندوں کی دادخواہ ہے قوم
بے کسوں کی امیدگاہ ہے قوم[۱۳]

فروری میں انجمن حمایت اسلام کے ۱۶ویں سالانہ اجلاس میں ڈپٹی نذیر احمد نے طنزیہ نظم پڑھی جس میں اُن مولویوں کا مذاق اُڑایا گیا تھا جو مذہبی خدمت کے جوش میں بیکار ہو کر معاشرے پر بوجھ بن جاتے تھے۔[۱۴]

۲۴ تاریخ کو اقبال نے دردِ دل یعنی یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' سنائی۔ پچھلے برس کی طرح اِس دفعہ بھی کاپیاں چھپوا کر ساتھ لائے تھے۔ بعض کاپیاں چار چار رُوپے کی بکیں۔

۸

مُنشی فوق نے ہفتہ وار اخبار نکالنے کی ٹھانی۔ پنجۂ فولاد نام تجویز ہوا اور مرزا داغ سے قطعۂ تاریخ لکھوایا گیا۔ اقبال نے بھی چوبیس اشعار کا تعارف لکھا جس میں اخبار کے مستقل کالموں بزمِ فوق، ضامنِ صحت، تجارت، مذاقِ سخن، مشاہیر، لطائف، سیٹلمنٹ آفس کا ذکر کرنے اور اخبار کا سالانہ چندہ "تین رائج سکے قیمت سال کی" بتانے کے بعد یہ بھی بتایا تھا کہ "اِس بانکے پرچے کا مدیر" کون ہے:

نام ہے اُس کا محمد دین فوق
عمر چھوٹی ہے مگر ہُشیار ہے[۱۵]

اُس زمانے میں فوق غزلوں کے گلدستے بہارِ گلشن کے نام سے شائع کرتے تھے۔ اُسی برس یہ جمع ہو کر گلشنِ نوبہار کے نام سے شائع ہوئے جس میں اقبال کے بارے میں ایک سوانحی نوٹ بھی شامل تھا:

[اقبال]

شیخ محمد اقبال (ایم اے) تخلص اقبال، وطن سیالکوٹ۔ ابھی بالکل نوجوان ہیں۔ عمر چھبیس سال کے قریب ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی میں مکمل استعداد رکھتے ہیں۔ حضور ملکہ معظّمہ کے انتقالِ پرملال پر آپ نے جو دل گداز

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

نظم ''اشکِ خونیں'' لکھی گورنمنٹ پنجاب نے اپنے صَرف سے اس کی کئی ہزار کاپیاں مختلف زبانوں میں چھپوائیں۔ فصیح الملک حضرت داغ سے اصطلاح لیتے ہیں۔ انگریزی خیالات کو اُردو شاعری میں بڑی خوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔ آج کل قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ہیں۔[16]

۹

کئی لوگ 'ہمالہ' کو اشاعت کے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے مگر اقبال کے خیال میں نظم اصلاح طلب تھی۔[17] ممکن ہے کہ 'اشکِ خوں' اور 'دردِ دل' میں ساخت کی جو پختگی دریافت کر چکے تھے اُس کے مقابلے میں 'ہمالہ' کی بندش ڈھیلی نظر آتی ہو۔

۱۰

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں پرنٹنگ پریس کی مقبولیت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ آئے دن کوئی نیا اخبار یا رسالہ وجود میں آتا اور کچھ عرصہ جاری رہ کر اپنے بانی کے شوق کی طرح ختم ہوتا رہتا تھا۔

شیخ عبدالقادر اُن دنوں بلند پایہ انگریزی اخبار آبزروَر کے چیف ایڈیٹر تھے۔ بازارِ حکیماں کے مشاعروں اور لٹریری سوسائٹی کی محفلوں میں اقبال کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے مگر خود شاعری نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۰۱ء کی پہلی سہ ماہی میں انہیں بھی ادبی رسالہ نکالنے کا خیال آیا۔ رسالے کا نام تجویز ہوا مخزن۔ اقبال نے بھی نظم دینے کا وعدہ کیا مگر اپنی مشہور کاہلی کے باعث ٹالتے رہے یہاں تک کہ آخر ایک دن عبدالقادر نے 'ہمالہ' کا مسودہ اُٹھا لیا اور اقبال کے احتجاج کے باوجود کہ نظم ابھی قابلِ اصلاح ہے اُسے لے جا کر کاتب کے حوالے کر دیا۔[18]

مخزن اپریل کے وسط میں شائع ہوا۔ سرورق پر ہندوستان کا نقشہ تھا جس میں تین مختلف نشانات سے اُن مقامات کی شناخت کی گئی تھی جنہیں اُردو کا گہوارہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ رسالے کا بنیادی مقصد ''آسان اور تفریحی مطالعے کا کافی سامان'' فراہم کرنا تھا جس کے پس منظر کے متعلق شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا، ''بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہے اور ہو سکتا ہے۔ اس کو اپنے دلداروں کی تعداد کا گھمنڈ ہے اور بجا ہے۔ مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسہ ہے اور درست ہے۔ اور سب سے بڑی تسلی اسے یہ ہے کہ زمانہ کی رفتار اُس کے موافق ہے۔ یہ نیا مذاق ملک

(c) 2014, Iqbal Academy, Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میں بہت کچھ تہذیب الاخلاق کے نامور ایڈیٹر اور اُس کے ہمراہیوں اور حسن کے فاضل مضمون نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور گو یہ دونوں بیش بہا رسالے اب موجود نہیں۔ مگر ان کے قیمتی مضامین موجود ہیں۔ اور ملک کے لٹریچر پر ان کا اثر موجود ہے۔ اور یادگار رہیگا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ملکی لٹریچر ابھی اس قسم کی خدمات سے مستغنی نہیں۔ جوان رسالوں نے کیں تھیں۔ اور کسی قدر ضروریات اور حالات بھی بدل گئے ہیں۔ اور متقاضی ہیں۔ کہ کوئی علمی رسالہ مناسبِ حالاتِ وقت نکلے۔ ہم میں اور ان بزرگواروں میں جنہوں نے اِس سنگلاخ زمین میں سفر مینا کا کام کیا کوئی نسبت نہیں۔ ہم ان کے خوان کے زلّہ ربا ہیں۔ مگر چونکہ انکی سرتوڑ محنتوں سے اب راستہ بھی آسان ہو گیا ہے۔ ہم بھی اِس طریق میں رہروی کا عزم کر سکتے ہیں۔"

'ہمالہ' صفحہ ۳۵-۳۳ پر شائع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے نوٹ میں شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا، "شیخ محمد اقبال صاحب۔ اقبال۔ ایم۔ اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔ جو علومِ مغربی و مشرقی دونو میں صاحبِ کمال ہیں۔ انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں کوہِ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں۔"

اگلے ماہ اقبال کی ایک اور نظم 'گلِ رنگیں' شائع ہوئی جس میں ادب کا وہ رُومانوی نقطۂ نظر پیش کیا گیا تھا جو اُس زمانے میں اقبال کا مسلک بھی تھا اور مخزن کے نئے والے ادیبوں سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد، خوشی محمد ناظرؔ، مہدی افادی، حسن نظامی اور حسرتؔ موہانی وغیرہ کا بھی:

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے اُلجھاؤں سے کیا
دِیدۂ بُلبُل سے مَیں کرتا ہُوں نظّارہ ترا

عبدالقادر حیدر آباد دکن گئے تو داغؔ کو اِس بات پر فخر کرتے سنا کہ اقبال کبھی اُن سے اِصلاح لے چکے ہیں۔[19]

۱۱

اقبال کی مشکل پسندی پر اعتراض بھی ہوئے جن سے وہ اتنے بددل ہوئے کہ بعض بے تکلف دوستوں سے کہہ دیا کہ آیندہ شعر نہ کہیں گے۔ اُنہوں نے سمجھایا کہ جتنے اشعار پر تنقید ہو رہی ہے اُس سے زیادہ اشعار کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ اقبال کا شعر گوئی ترک کرنا ملک میں ادب کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اسی زمانے میں دُور دُور سے داد ملنے لگی یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانی نے کہہ دیا، ''جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ آپ کو ڈھونڈھیں گے۔'' تفصیل معلوم نہیں کہ یہ بات مولانا شبلی نے کس موقع پر کہی مگر بہرحال اِس قسم کی باتوں نے دوبارہ اقبال کی ہمت بندھا دی۔[۲۰]

۱۲

یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں جب بازارِ حسن میں بڑے شاعروں کا کلام گایا جاتا تھا ۱۹۰۱ء کے عرصے تک اقبال کی غزلیں بھی طوائفوں میں مقبول ہو چکی ہوں گی۔ اقبال گانا سننے تو پہلے ہی جایا کرتے تھے مگر اب ممکن ہے بعض گانے والیاں خود اُن کی تشریف آوری کو بھی اہمیت دیتی ہوں۔ بہرحال حقیقت ہے کہ جوانی کے ایک دور میں اُنہیں بازارِ حسن کے معاملات میں سند مانا جاتا تھا اور بے تکلف دوست اِن معاملات میں اُن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

''جس زمانے میں مَیں زندہ تھا،'' اقبال لکھتے ہیں۔ ''یا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا تو تجربے نے یہ اُصول سکھایا کہ جس معشوق سے زیادہ محبت ہو اُس سے اصولاً زیادہ بے اعتنائی کرنی چاہیے... یار لوگوں نے فرمائش کی... کہ ہر اُصول پر ایک مفصل رسالہ لکھنا چاہیے کہ تماش بینوں کے لیے رہنمائی کا کام دے۔ سو بندے نے ایک رسالہ موسوم بہ اَجرُ السُّکُوت تحریر کیا... جس میں سکوت کے ایسے ایسے دلائل پیش کیے... کہ فرید الدین عطّار بھی اگر اِس رِسالے کو پڑھتے تو اپنے فضائلِ خاموشی کو فراموش کر جاتے۔ وہ سینہ بہ سینہ شائع ہوتا تھا۔''[۲۱]

غزل

نہ آتے ہمیں اِس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہُوئے عار کیا تھی

تامل تو تھا اُن کو آنے مِیں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ اِنکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طُور مُوسیٰ

کشش تیری اے شوقِ دِیدار کیا تھی
نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو
مِری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی؟
لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل مِیں
کرامت تھی شرمِ گنہ گار کیا تھی!
کہیں ذِکر رہتا ہے اقبالؔ! تیرا
فُسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

یہ غزل جس کے سترہ اشعار دستیاب ہیں، نہیں معلوم کب کی ہے مگر مخزن کے جون کے شمارے میں اس کے چھ اشعار 'کچکول' کے حصے میں ص ۷۴ پر شائع ہوئے۔ انتخاب کرنے والے کا نام درج نہیں تھا۔[۲۲]

۱۳

اگلی غزل کے کم از کم سولہ اشعار ہوئے مگر اقبال نے صرف پانچ منتخب کر کے مخزن میں دیے جو مخزن جولائی ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئے:

نرالے ہیں انداز دُنیا سے اپنے
کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں[۲۳]

۱۴

انسان میں حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اِس لیے جذبات و معقولات کی پریشانی جمعیت کا سامان بھی بن سکتی ہے:

ہو گئی شرحِ رموزِ اتحادِ حسن و عشق
تیری یکتائی ہی آخر میری یکتائی ہوئی[۲۴]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

یہ خیال غزلوں میں آتا رہتا تھا مگر نظم میں تفصیل کا موقع ملا۔ پھول اِس کی واضح علامت تھا اور یہ بات 'گلِ رنگیں' میں بیان ہوئی جو مخزن میں مئی میں شائع ہوئی۔ مسدس تھی اور چھ بند تھے۔[۲۵]

کائنات ایک بہت بڑی علامت تھی جسے کھولنا شاعر کا کام تھا۔ اقبال یہ کام کر رہے تھے۔

عہدِ طفلی

تھے دیارِ نَو زمین و آسماں میرے لیے
وُسعتِ آغوشِ مَادَر اِک جہاں میرے لیے
تھی ہر اِک جنبش نشانِ لطفِ جاں میرے لیے
حرفِ بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لیے
درد اِس عالم میں جب کوئی رُلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ دَر مِیں لطف آتا تھا مجھے

مخزن، جولائی ۱۹۰۱ء

نظم میں پانچ بند تھے اور بظاہر اِس کی ہیئت سے بھی اقبال مطمئن نہیں تھے۔[۲۶]

۱۵

نری شہرت زندہ رہنے کے لیے کافی نہ تھی۔ جولائی میں ایک دفعہ پھر اورینٹل کالج منتقل ہوئے جس کی تنخواہ وہی بہتّر روپے چودہ آنے تھی مگر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا امتحان کوئی دو مہینے بعد ہونے والا تھا اور اُمید تھی کہ جس ذہانت نے شہرت بخشی ہے وہی باقی مسائل بھی حل کر دے گی۔

۱۶

معلوم ہوتا ہے کہ پوری سنجیدگی کے ساتھ امتحان کی تیاری کر رہے تھے کیونکہ اگست کے مخزن میں اُن کی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی۔ مگر وہ ذہن جس کے متعدد خانوں میں بیک وقت کئی موضوعات پلتے تھے امتحان کی فکر کے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ساتھ ساتھ اپنے ادبی نصب العین پر غور کر رہا تھا۔

اگست کے قریب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شاعری کا مقام معاشرے میں وہی ہے جو ہمالیہ کی خاموش فضاؤں میں اس کے دامن میں بہتے ہوئے جھرنے کا ہے۔[۲۷] شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ ان تصورات کو آواز کا جادو عطا کر دے جن تک دوسرے لوگوں کی پہنچ نہیں ہوتی۔

قریب کے زمانے میں شاعری کے اس نصب العین کی مثال مغرب میں گوئٹے اور مشرق میں مرزا غالب تھے۔ ایک عرصے سے اقبال کی تقریباً ہر لمبی نظم میں کوئی نہ کوئی ٹکڑا یا مصرعہ غالبؔ سے ماخوذ چلا آ رہا تھا مگر اُن کی غالب پسندی یہیں تک محدود نہیں تھی۔ آم کھانا، مولویوں کو تنگ کرنا، ہندوؤں سے دوستی کرنا، اپنی بے نمازی کی تشہیر کرنا اور کبھی کبھی تھوڑا سا کفر بکنا، غالب کی یہ تمام عادتیں اُن میں موجود تھیں۔ شراب نوشی کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر بعض لوگوں کا یہ خیال درست ہے کہ جوانی میں چکھ کے بعد میں ترک کر دی تھی تو پھر ہو سکتا ہے کہ اُس چکھنے کی وجہ بھی غالب کی پیروی ہو۔ عبدالقادر تو یہاں تک کہنے پر مجبور ہوئے، "اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خان غالبؔ (کی روح) نے دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"[۲۸]

غالب پر نظم لکھنے بیٹھے تو مسدس میں بھی نظم کی ساخت میں ویسا ہی شکوہ آ گیا جیسا ترکیب بند میں پیدا کر چکے تھے۔ پانچ بند، ہر بند میں چھ مصرعے، اقبال نظم کی صورت سے کافی مطمئن معلوم ہوتے تھے:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا[۲۹]

۱۷

اقبال عام طور پر فرمایش پر شعر نہ کہہ سکتے تھے مگر کبھی کبھی فرمایش پوری بھی کر دیتے تھے۔ ایسی ہی کسی فرمایش پر آٹھ دس منٹ میں ایک چھوٹی سی نظم کہہ دی:

ہم نچوڑیں گے دامن

سراپا ہوا مثلِ آغوشِ دریا

(c) 2014. Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

نہانے کو اُترا جو وہ رشکِ گلشن
پئے دِید کھولیں حبابوں نے آنکھیں
اُٹھائی نظارے کو موجوں نے گردن
اسیرِ خمِ زلف کیونکر نہ ہو خضر
یہ قامت، یہ عارض، یہ سینہ، یہ جوبن
اُدھر سر حبابوں نے ساحل سے پٹکے
نہا کر جو نکلا وہ دریا سے پُرفن
ہوئی خوں فشاں چشمِ گرداب ایسی
کہ دریا ہوا غیرتِ صحنِ گلشن
جو دستِ حنائی سے دامن نچوڑا
کہا مَیں نے ''اے روکشِ شمعِ روشن!
کہیں آگ سے بھی ٹپکتا ہے پانی؟
بجا ہے جو کہیے تجھے سامری فن
مِری چشمِ گریاں کی تجھ کو قسم ہے
صنم! چھوڑ دے، ہم نچوڑیں گے دامن''

کشمیری گزٹ، ستمبر ۱۹۰۱ء[۳۰]

'مرزا غالب' بھی ستمبر میں مخزن میں شائع ہوئی۔

۱۸

پیرزادہ عارف صاحب کی مثنوی عقدِ گوہر پچھلے برس شائع نہ ہو سکی تھی۔ اقبال نے تین نئے قطعاتِ تاریخ اُردو میں لکھ کر دیے۔ ایک سے ۱۹۰۱ء اور باقی دونوں سے ۱۳۱۸ھ برآمد ہوتا ہے۔

اِس برس کتاب چھپ گئی۔ دیگر قطعاتِ تاریخ کے ساتھ اقبال کے تمام چھ قطعات شامل تھے:

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

رُوح فردوس میں رُومی کی دُعا دیتی ہے
آپ نے خوب کِیا، خوب کہا، خوب لکھا[۳۱]

۱۹

ستمبر میں کالج کی تعطیلات تھیں یا اقبال خود ہی چھٹیاں لے کر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان کی تیاری کرنے سیالکوٹ چلے گئے۔

کالج کے دوست فضل حسین بیرسٹر بن چکے تھے اور کسی مقدمے کے سلسلے میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ نیرنگ جو پچھلے سال انبالے میں وکالت شروع کر چکے تھے اقبال سے ملنے پہنچ گئے۔ ان دونوں کی موجودگی نے اقبال کو اور زیادہ احساس دلایا ہوگا کہ اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود وہ عملی زندگی میں سست قدم ہوئے جا رہے ہیں اور اب بہت جلد انہیں اپنی ترقی کے لیے کوئی بڑا قدم اٹھانا چاہیے۔ اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان ایک ایسا بڑا قدم ہو سکتا تھا۔

سیالکوٹ میں پھر کالج کے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ اقبال نے آفتاب اور اعجاز کو بلایا اور نیرنگ سے تعارف کرواتے ہوئے آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "ایہہ آفتاب وانگوں سحر خیز اے!" نیرنگ کو اُس روز یقین آیا کہ اقبال واقعی صاحب اولاد ہیں۔ انہوں نے آفتاب سے کہا، "بھئی یہ تمہارا باپ ایسا ہی گپی ہے..."

ایک روز اقبال اور فضل حسین ایک گلاس میں کوئی سرخ رنگ کی چیز پی رہے تھے۔ نیرنگ کو دیکھ کر انہیں بھی دعوت دی۔ یہ بڑی دیر تک بچتے رہے۔ آخر وہ دونوں ہنس پڑے اور بتایا کہ شراب نہیں بلکہ ائیریٹڈ واٹر میں سرخ رنگ کا شربت ملا ہوا ہے۔[۳۲]

۲۰

ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحانات شاید ستمبر میں منعقد ہوئے۔ امتحان سے ایک روز قبل اُمیدواروں کا طبی معائنہ ہوا۔ میں اقبال کی دائیں آنکھ میں بینائی نہ ہونے کا معاملہ سامنے آیا اور طبی بنیادوں پر نااہل قرار پائے۔[۳۳]

پیسہ اخبار نے احتجاجی نوٹ لکھا کہ اقبال کی صحت تو قابل رشک ہے۔ بین السطور میں شکایت ظاہر ہو رہی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تھی کہ مسلمان اُمیدوار کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ فوق نے کشمیری گزٹ کے اکتوبر کے شمارے میں ''مسلمان اُمیدوار'' کے حوالے سے سرخی باندھی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اُمیدوار کا طبی امتحان کم از کم اتنا عرصہ قبل ہوا کرے جب اُمیدواروں نے امتحان کی تیاری شروع نہ کی ہو۔[۳۴]

اِس ناکامی کے بعد ہی اسٹراٹن صاحب نے اقبال کو مشورہ دیا ہوگا کہ امریکہ یا کینڈا کے کسی ادارے سے کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کریں۔ اقبال نے سفر کے لیے پیسے بچانے شروع کر دیے۔

۲۱

سوامی بیرونِ ملک تبلیغ کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے اقبال سے کہا ہوگا، ''ویدانت کی رُوح بس اتنی سی بات میں ہے کہ کسی مصیبت کو اپنے اُوپر طاری نہ ہونے دو۔ اپنے میں خدا کی موجودگی کے احساس سے ہمیشہ خوش اور پرسکون رہو!''

۲۲

میاں شاہ دیں ہمایوںؔ کشمیر گئے ہوئے تھے۔ اکتوبر کے مخزن میں اُن کی نظم شائع ہوئی جس کا موضوع اُن کی اکثر نظموں کی طرح کشمیر تھا:

اعجاز دیکھ تو سہی یاں کیا سماں ہے آج
نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے آج
اقبالؔ تیری سحربیانی کہاں ہے آج
ناظرؔ کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

۲۳

'''''شعری تجربے کے دوران میں میں نے اکثر اسے غور و فکر کے ذریعے سمجھنے اور گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''لیکن جیسے ہی میں اپنی کیفیت کا تجزیہ شروع کرتا ہوں وہ روانی اور الہام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔''[۳۵]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

"اُنھوں نے بتایا کہ ایک زمانے میں تو 'آمدِ شعر کوئی سال بھر سے زیادہ رکی رہی'، بعد کے زمانے کے ایک ملنے والے کا بیان ہے۔" چنانچہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے جو صلاحیت عطا ہوئی تھی وہ واپس لے لی گئی۔ لہٰذا انھوں نے سوچا کہ اب اردو نثر میں کچھ کام کی کتابیں لکھنی چاہئیں۔ اس زمانے میں اُنھوں نے معیشتِ سیاسی کی مبادیات پر ایک کتاب لکھی..."[۳۶]

معلوم ہوتا ہے وہ زمانہ یہی تھا۔

غزل

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لیے
اِس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے
قصہ خواں نے کیوں سُنا دی داستاں مجھ کو مری
رہ گیا تھا مَیں ہی کیا اپنے فسانے کے لیے؟
پاس تھا ناکامیِ صیّاد کا اے ہم صفیر!
ورنہ مَیں اور اُڑ کے آتا ایک دانے کے لیے
ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبالؔ نے
یہ غزل لکھی ہُمایوںؔ کو سُنانے کے لیے

مخزن، نومبر ۱۹۰۱ء[۳۷]

پوری غزل پر طبیعت کی بیزاری اور افسردگی کا رنگ نمایاں ہے جسے اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان میں ناکامی کا اثر سمجھا جا سکتا ہے۔ آخری مصرع سے ذہن غالبؔ کی طرف جاتا ہے:

مجھ کو غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی

ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

نومبر میں 'ابرِ کہسار' مخزن میں شائع ہوئی جو ایک طرح سے 'ہمالہ' کے تسلسل کی نظم تھی۔ مسدس کے دس بند تھے۔[۳۸]

۲۴

اُسی برس حالی نے سرسید کی سوانح حیاتِ جاوید شائع کروائی۔ اِس کے آخر میں مولوی میر حسن اور اقبال کی نکالی ہوئی سرسید کی وفات کی تاریخیں خاص طور پر درج تھیں مگر ان دونوں کے نام نہیں لکھے گئے تھے۔ میر حسن نے حالی کو لکھ دیا کہ براہِ کرم آیندہ ایڈیشن میں نام بھی شامل کیے جائیں۔[۳۹]

دسمبر میں مخزن میں انوکھے لب و لہجہ کی غزل شائع ہوئی جس نے ایک نئے شاعر کو اچانک مشہور کر دیا۔ شاعر کا نام حسرت موہانی اور غزل کا مطلع تھا:

بھلاتا لاکھ ہُوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ اُلفت پہ وہ کیونکر یاد آتے ہیں

۲۵

اُس سال کسی وقت اقبال کو بچوں کی نفسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ورڈز ورتھ سے اقبال کو دلچسپی تھی اور ورڈز ورتھ نے بچپن کو اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اقبال کی ایک نظم "عہدِ طفلی" بھی مخزن (جولائی ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔

۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء میں محکمہ تعلیم پنجاب کی جانب سے اُردو کی پانچویں کتاب کا نیا ایڈیشن تیار ہوا تو اورینٹل کالج سے وابستگی، آرنلڈ کی سفارش یا خود اُن کی ذاتی شہرت کی وجہ سے اُن کی دو نظمیں شامل کی گئیں۔ یہ 'ایک مکڑا اور مکھی' اور 'ہمدردی' تھیں۔[۴۰]

۱۹۰۱ء ہی میں کسی وقت اقبال نے بچوں کی نفسیات پر مغربی ماہرینِ تعلیم کی تحریریں پڑھیں اور اپنی معلومات کو مخزن کے حصہ نثر کے لیے قلم بند کیا۔ اُنہوں نے لکھا، "تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

علمی اُصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں"۔

اقبال نے اپنے مضمون میں گیارہ اُمور کی فہرست بنائی تھی جو "عالم طفلی کے ساتھ مختص ہیں":

۱۔ بچوں میں اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے۔

۲۔ اس عمر میں کسی شے پر مسلسل توجہ نہیں ہو سکتی۔

۳۔ بچوں کو اشیا کو غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کے چھونے میں لطف آتا ہے۔

۴۔ بچے کی توجہ صورت سے زیادہ رنگ کی طرف جاتی ہے۔

۵۔ بچے میں بڑوں کی مدد کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔

۶۔ قوت متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ کہانی میں وہ اسی لیے دلچسپی لیتے ہیں۔

۷۔ بچے میں ہمدردی کی علامات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ کسی کو ہنستا دیکھے تو خود بھی ہنستا ہے۔ ماں باپ غمگین نظر آئیں تو خود بھی ویسی ہی صورت بنا لیتا ہے۔

۸۔ الفاظ یاد رکھنے کے لیے بچہ کا حافظہ حیرت ناک ہے۔

۹۔ اشیا میں فرق کرنے کی قوت کمزور ہوتی ہے۔

۱۰۔ قوائے عقلیہ مثلاً تصدیق definition اور استدلال کمزور ہوتے ہیں۔ یہ تجربے اور علم کے ساتھ بڑھتے ہیں... بچے سے ایسی فہمید کی توقع نہ رکھو جو ابھی تجربے اور علم سے بڑھنی ہے۔ ایک برس کے بچے کو کیا علم کہ "حبِ وطن" کس جانور کا نام ہے۔ ہمارے بعض معلم بچہ کے ہاتھوں میں ایسی ابتدائی کتابیں رکھ دیتے ہیں جن کا پہلا باب مثلاً خدا کی صفات سے شروع ہوتا ہے۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ خدا ایک ایسا مجرد تصور ہے جو قوائے عقلیہ کی حدِ کمال پر پہنچنے اور بہت سا علم حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور صفاتِ شے کا اُس شے سے علیحدہ تصور کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بچے سے کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اِس قسم کا علم دینا ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے اچھا ہو مگر علمی اصولوں کی رُو سے بچے کے حافظہ پر ایک بے جا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے زیادہ نہیں۔

۱۱۔ اخلاقی محرکات سے بچہ یا تو متاثر ہی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔ اخلاقی ذمہ داری کا احساس اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔[۴۱]

مضمون کا پُر اُمید لب ولہجہ قابل غور ہے گویا اقبال بچے کو نہایت مفید قوتوں کا مجموعہ تصور کرتے ہیں کہ ذرا سی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

احتیاط اِن قوتوں کو انسانیت کی بھلائی پر گامزن کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا یہ حسنِ ظن بھی خوب ہے کہ "تمام قومی عروج کی جڑ" کوئی ایک چیز ہو سکتی ہے جس پر توجہ کرنے سے "تھوڑے ہی عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں"۔ ایسی تراکیب اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں چھپے اِس خیال کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پوری دینا کا ایک دل کش خواب کی طرح حسین ہو جانا ممکن تھا۔

۲۶

مخزن کے جنوری ۱۹۰۲ء کے شمارے میں ص ۴۷-۴۵ پر 'کلامِ آزاد' کے عنوان سے مولانا محمد حسین آزاد کی چار غزلیں شائع ہوئیں۔ پہلے کی لکھی ہوئی ہوں گی:

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

۲۷

کوئی پارسی جمشید جی تھا جسے عرفِ عام میں جمسیٹ جی کہتے تھے۔ غالباً لاہور ہی میں اُس کا نیلام گھر تھا۔[۴۲]

۲۸

میاں شاہ دین کی لٹریری سوسائٹی اور عبدالقادر کا مخزن اقبال کی نظموں کو ایک وسیع دائرے میں لے آئے تھے۔ لکھنؤ والے بھی توجہ دینے لگے۔ وہاں کے رسالے خدنگِ نظر کی فرمائش پر اقبال ایک نظم لکھنے بیٹھے۔

وہ حیاتِ جاوداں کے طلب گار تھے مگر روشنی کے سمندر میں پروانے کا بیخود ہو کر فنا ہو جانا ایک ایسی علامت تھی جس کی گہرائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زندگی کی روحانی اساس کے لیے کسی نہ کسی قسم کی فنا کے مرحلے سے گزرنا ضروری تھا۔ اِس تجربے کو اقبال کے اپنے جذبے کی سچائی کے مطابق بیان کرنے کے لیے جس اسلوب کی ضرورت تھی وہ دریافت نہ ہوا تھا اِس لیے اُنھوں نے شمع ہی سے پوچھ لیا کہ پروانہ اُس سے پیار کیوں کرتا ہے:

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟
شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا؟

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

نظم کا عنوان 'شمع و پروانہ' تھا۔ مثنوی کی ہیئت میں بارہ اشعار تھے۔[۴۳]

۲۵

'بچوں کی تعلیم و تربیت' مخزن (جنوری ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا۔ اُسی ماہ خدنگِ نظر لکھنؤ میں 'شمع و پروانہ' بھی چھپی جس سے پہلے ادارتی نوٹ میں تھا، "اِس نمبر میں ہم شمع و پروانہ کے عنوان سے مسٹر محمد اقبال ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج کی ایک نوتصنیف نظم شائع کرتے ہیں۔ جو پروفیسر صاحب نے ہمارے اِصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے تاہم اِن اشعار سے اُن کے فن و زباں دانی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔"

۲۶

'خفتگانِ خاک سے استفسار' میں مرنے والوں سے عدم کی کیفیت پوچھی گئی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اِس میں اگلی دنیا کا خوف نہیں بلکہ اُس کے بارے میں تجسس نمایاں تھے:

تم بتا دو راز جو اِس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اِک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

یہ چالیس اشعار کی ترکیب بند تھی۔ اِس میں دو بند تھے۔[۴۴]

موت سے خوف نہ کھانا اُس عقیدے کی وجہ سے رہا ہوگا جسے اسلام کہتے تھے اور سرسید کے مطابق جس کی سچائی کو آنکھیں کھول کر دیکھا جا سکتا تھا۔ تاریخ کی کتنی ہی قیامتوں میں اسلام دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھا تھا۔ میر حسن ملازمت کرنے نکلے تھے تو عیسائی مشنریوں کے اسکول کے سوا کہیں جگہ نہ ملی تھی مگر آج مسلمانوں کے اپنے کالج علی گڑھ، لاہور اور نجانے کہاں کہاں موجود تھے۔ یہ سب اُس بوڑھے کی بیخودی کا نتیجہ تھا جس نے مولوی میر حسن سے کہا تھا کہ مسلمان قوم کے لیے دُعا مانگیں جس کا کوئی آسرا دکھائی نہیں دیتا۔ آج وہ قوم پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل تھی۔

اقبال کے شعور میں یہ بات روشن ہو رہی تھی کہ فرد اور قوم ایک دوسرے کے آئینہ دار ہیں۔ اگر تاریخ نے شہادت دی ہے کہ اسلام ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے تو یہ مسلمان کی حیاتِ جاوداں کا ثبوت بھی ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

آیندہ جلسے کے لیے جو نظم لکھی اُس کا عنوان تھا، 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے۔' یہ ترکیب بند تھی جس میں نو بند تھے جس طرح کشمیر کے لیے لکھے ہوئے قطعات بھی نو تھے۔ 'اشکِ خوں' کی طرح اِس کے ہر بند میں بھی گیارہ اشعار تھے۔ ہر بند کا ٹیپ کا شعر فارسی میں تھا اور آخری بند پورا فارسی میں تھا۔[۴۵]

پہلی بار یہ احساس شدّت کے ساتھ دکھائی دیا کہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُس کے لیے الفاظ کافی نہیں ہیں، قصہ مطلب طویل اور دفترِ تقریر تنگ ہے، ''خود بخود کوئی سمجھ جائے کہ کیا کہنے کو ہیں''! نظم میں اسلامیہ کالج مسلمانوں سے خطاب کر رہا تھا گویا تعمیر معمار سے اور آئینہ سکندر سے خطاب کر رہا تھا مگر کون کس کا رہینِ منت ہے، کالج مسلمانوں نے بنایا ہے یا مسلمان اور کالج دونوں اسلام کی اُس باطنی زندگی کے تابع ہیں جو ابھی تک تاریخ کے پردوں میں پنہاں تھی مگر اب علم کے آئینے میں ظاہر ہونے کے لیے بیتاب ہے؟ الفاظ میں واضح کرنا محال تھا۔ نظم کی ساخت پر غور کر کے ہی جواب سمجھا جا سکتا تھا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے جہاں سے بھی ملے اُسے حاصل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے آخری نبی ہونے کا اعلان کر کے ہر طرح کے پروہتی نظام کی بنیاد ختم کر دی اور عقل و شعور کے دروازے کھول دیے تھے۔

مسلمان قوم کی جمعیت کا راز یہی تھا کہ جس طرح خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا اُسی طرح اسلامی قومیت میں کسی کو شریک کرنا بھی جائز نہ تھا۔ پہلے گناہ کا نام شرک اور دُوسرے کا منافقت تھا۔

نظم کا آخری بند جو فارسی میں نعتیہ تھا اُس میں مسلمان قومیت کی یہی رمز بیان ہوئی اور اسلامیہ کالج نے رسولِ اکرمؐ سے مسلمانوں کے لیے دُعا فرمانے کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ آپؐ کے بعد کسی اور کی نبوت کسی بھی مفہوم میں تسلیم کرنا شرک کے مترادف ہے کیونکہ آپؐ دنیا کی محفل میں عرفان کی شمع کی روشنی عام کر گئے ہیں:

اے کہ بعد از تُو نبوّت شُد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن زِ نورِ شمعِ عرفاں کردۂ

خضر کے پاس باطن کا علم تھا اور قید خانے میں خدا نے یوسف کو خوابوں کی تعبیر کا علم دے دیا تھا۔ مسلمان قوم بھی یوسف کی طرح قید خانے میں تھی اور حسد کرنے والے بہت تھے مگر کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ علم اور آزادی کا وہ خواب جو نئے زمانے کے فرعونوں نے بیان کیا تھا اُس کی تعبیر اِسی غریبُ الوطن کے پاس ہو؟

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

غالبؔ نے صریرِ خامہ کو نوائے سروش یعنی غیب سے مضامین لانے والے فرشتے کے پروں کی آواز کہا تھا۔ اقبال صریرِ خامہ کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع کر رہے تھے جسے اُن کی آیندہ شاعری میں بار بار آنا تھا:

ہے سُوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں
ہم صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہیں

نوائے سروش نے منزل کا پتہ دیا تھا۔ بانگِ درا منزل کی طرف بڑھنے کا اعلان کرنے والی تھی۔[۴۷]

اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے

بند ۳

میں صدف تم ابرِ نیساں میں گلستاں تم بہار
مزرعِ نوخیز میں، تم ابرِ دریابار ہو
میں نتیجہ اک حدیثِ اُمّیِ یثرب کا ہُوں
تم اُسی اُمّی کی اُمت کے علم بردار ہو
اِک مہِ نَو آسمانِ علم و حکمت پر ہُوں میں
تم بھی ایک فوجِ ہلالی کے سپہ سالار ہو
نام لیوا ایک دیارِ علم و حکمت کا ہُوں میں
اور تم اگلے زمانوں کے وہی انصار ہو
یاں کبھی بادِ خزاں کا رنگ جم سکتا نہیں
میں مسلمانوں کا گلشن تم مِری دیوار ہو
تم اگر چاہو تو اِس گلشن کے ایسے بھاگ ہوں
ہر کلی گل ہو کے اِس کی زینتِ دستار ہو
رہنے والے انتخابِ ہفت کشور کے ہو تم
کیوں نہ اِس گلشن کی نکہت رُوکشِ تاتار ہو

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میری دیواروں کو چھُو جائے جو اِکسیرِ عطا
خاک بھی میری مثالِ گوہرِ شہوار ہو
دیکھ اے ذوقِ خریداری! یہ موقع ہے کہیں
حسنِ یوسف سے نہ خالی مصر کا بازار ہو

یوسفِ علم استی و ہنجاب کنعانِ من است
از دمیدِ صبحِ حکمت چاک دامانِ من است

بند۴

مجھ میں وہ جادو ہے روحوں کو بنا سکتا ہُوں میں
قوم کے بگڑے ہوؤں کو پھر بنا سکتا ہُوں میں
عید ہوں میں اے نگاہِ چشمِ نظارہ! تری
شاہدِ مقصود کا پردہ اُٹھا سکتا ہُوں میں
طیرِ حکمت باغِ دنیا میں ہُوں اے صیّاد میں
دام تُو سونے کا بنوا لے تو آ سکتا ہُوں میں
طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر
آہ وہ دل کش مرقع پھر دکھا سکتا ہُوں میں
آئیں اُڑ اُڑ کر پتنگے مصر و روم و شام سے
شمع اِک پنجاب میں ایسی جَلا سکتا ہُوں میں
آزما کر تم ذرا دیکھو مِرے اعجاز کو
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دِکھا سکتا ہُوں میں
گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اِس زمانے کو سُنا سکتا ہُوں میں
ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

پھر وہی محفل زمانے کو دِکھا سکتا ہُوں میں
گھر کسی کا جن کی ضَو سے غیرتِ مشرق بنے
اِس انوکھی شان کے موتی لٹا سکتا ہُوں میں
کارواں سمجھے اگر خضرِ رہِ ہمت مجھے
منزلِ مقصود کا رستہ دِکھا سکتا ہُوں میں

از خُمِ حکمت بروں کردم شرابِ ناب را
ہا مبارک سرزمینِ خطّۂ پنجاب را

بندے

ہاں رگِ ہمت کو اپنی جوش میں لائے کوئی
عشقِ اِخواں کا اثر دنیا کو دکھلائے کوئی
جوشِ ہمدردی میں پنہاں دولتِ ایماں ہے بس
نقشۂ خیرالقرون آنکھوں کو دکھلائے کوئی
ہے پریشاں بادِ ناکامی سے گیسوئے مراد
شانۂ دستِ عطا سے اس کو سلجھائے کوئی
بہرِ استقبال استادہ ہے ہر گل کی کلی
اِس چمن میں صورتِ بادِ صبا آئے کوئی
یہ گل و گلزار صدقہ اُمّیِ یثرب کا ہے
دیکھنا اے باغباں! غنچہ نہ مرجھائے کوئی
مدّعا کو یہ سکھایا شورشِ فریاد نے
خودبخود میری طرح منہ سے نکل آئے کوئی
کہ گئی ذوقِ کرم کو شوخیِ حسنِ طلب
ہاتھ سے عاشق کا دل بن کر نکل جائے کوئی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِک چھٹا دریا رواں ہونے کو ہے پنجاب میں
ابر کی صورت اُٹھے، اُٹھ کر برس جائے کوئی
تاک میں بیٹھی ہوئی ہے شوخیِ دستِ طلب
دیکھیے اِس بزم سے بچ کر کہاں جائے کوئی
فکرِ دیں کے ساتھ رکھنا فکرِ دنیا بھی ضرور
ہیں بہت دشمن کہیں دھوکا نہ کھا جائے کوئی

خویش را مسلم ہمی گویند و با ما کار نیست
رشتۂ تسبیحِ شاں جز رشتۂ زُنار نیست

ساتویں بند میں مسلم قومیت کے لیے "عشقِ اخواں" یعنی بھائیوں کی محبت، لفظ "برادری" کا شاعرانہ ترجمہ تھا کیونکہ برادری کو انگریزی لفظ کمیونٹی کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ یہ باغ نبیؐ کی امانت ہے لہٰذا اِس کا کوئی پھول مرجھانے نہ پائے، یہ وہی نصیحت تھی جو شیخ نور محمد نے اقبال کو کی تھی جب کالج کے زمانے میں اُنہوں نے ایک سائل کر جھڑکنے کی غلطی کی تھی۔

نظم میں خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ نصبُ العین آفاقی تھا مگر عملی اقدام کے لیے زمین کے کسی خطّے پر مضبوطی سے پاؤں جما کر کھڑا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

۳۰

مرزا غلام احمد نے حکم دیا کہ کوئی احمدی کسی غیر احمدی کے جنازے میں شریک نہ ہو۔ اِس مسئلے نے اُن خاندانوں میں کشمکش پیدا کر دی جن کے بعض افراد احمدی اور بعض غیر احمدی تھے۔ اُنہی میں میر حسام الدین کا خاندان بھی تھا۔ اُن کے بیٹے میر حامد شاہ احمدیت کے پرجوش مبلغ تھے مگر اپنے والد کے چچازاد بھائی میر حسن سے محبت بھی کرتے تھے۔ ایک دن مسجد میں بیٹھے تھے کہ کسی نے پوچھ لیا، "کیا اپنے چچا کے جنازے میں بھی نہیں جاؤ گے؟" جذبات سے مغلوب ہو کر ہاتھ اُٹھائے اور کہا، "خدا مجھے اُن سے پہلے اُٹھا لے!"[۴۷]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۳۱

شیخ نور محمد کی لڑکی طالع بی ۱۹۰۲ء میں فوت ہوئیں۔[۴۸]

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بہن کے جنازے میں شریک ہونے سیالکوٹ آئے تو میر حامد شاہ نے اُنہیں بھی بیعت کی دعوت دی۔[۴۹]

۳۲

'خفتگانِ خاک سے استفسار' فروری میں مخزن میں شائع ہوئی۔[۵۰]

اُس ماہ انجمن حمایت اسلام کا سترہواں سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر (یعنی گورنر یا عوام کی زبان میں لاٹ صاحب) سر ولیم میکو رتھ ینگ تشریف لا رہے تھے۔ ڈائرکٹر تعلیم ولیم بل بھی آنے والے تھے۔ اقبال کو قصیدہ کہنا تھا۔[۵۱]

۳۳

ادبی روایت میں قصیدے کا مقصد حقیقت نگاری نہیں تھا۔ یہ شاعر کے ایمان دھرم کا نہیں بلکہ اُس کے تخیل کا امتحان ہوا کرتا تھا مگر شہنشاہ اکبر کے زمانے میں عرؔفی شیرازی نے غضب کیا تھا کہ اکثر قصیدوں میں بادشاہ یا امیر ساتھ ساتھ اپنی تعریف کا پہلو بھی لے آیا تھا۔ اُس کا مزاج کچھ ایسا ہی تھا اور اُس کا وہ شعر اقبال کے دل و دماغ پر نقش تھا جس میں کہا گیا تھا کہ خدا کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ عمل کے بغیر جنت دے دے مگر میری خودداری سے بعید ہے کہ میں ایسی جنت قبول بھی کر لوں![۵۲]

اقبال نے لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر تعلیم کی مدح کے لیے ذوؔق کے مشہور قصیدے، ''زہے نشاطِ فراواں اگر کیجیے اِسے تحریر'' کی زمین منتخب کی مگر واضح کیا کہ مہمانوں کا خیر مقدم کرنے والی قوم وہ ہے جس نے اپنی مدد آپ کے تحت ایسا شاندار کالج بنایا ہے۔ دل کی ولایت تلواروں سے نہیں بلکہ نگاہ سے تسخیر ہوتی ہے اور دُنیا میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں اُن کی وجہ سے بعض پرانے تصوّرات کو بدلنے کی ضرورت ہے مثلاً اِطاعت کا مقصد حکمرانوں کی خوشنودی نہیں بلکہ یہ اپنی چھپی ہوئی قوّتوں کو مجتمع کرنے کا نسخہ ہے:

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

جو بزم اپنی ہے طاعت کے رنگ میں رنگیں
تو درس گاہ رموزِ وفا کی ہے تفسیر
اِسی اصول کو ہم کیمیا سمجھتے ہیں
نہیں ہے غیرِ اطاعت جہان میں اِکسیر

اِطاعت اور خودداری کا باطنی تعلق سرسید کی تحریک کے اُن رموز میں سے تھا جنہیں صرف اقبال ہی پوری طرح سمجھے تھے۔ قصیدے کا نام 'خیر مقدم' تھا اور اِس میں بائیس اشعار تھے۔

قصیدے کی زمین ذوقؔ سے ضرور لی گئی تھی مگر بعض لحاظ سے اِس میں عرفی کا اثر جھلکتا تھا۔ وہ قصیدہ کہتے ہوئے اپنی خودداری کا اندازہ بھی کروادیتا تھا اور یہاں شاعر نے اپنی قوم کی خودداری کا احساس دلوایا تھا:

مدد جہان میں کرتے ہیں آپ ہم اپنی
غریب دِل کے ہیں لیکن مزاج کے ہیں امیر

عرفی کو بھی قصیدے میں سورج کی علامت سے معانی آفرینی پیدا کرنا مرغوب تھا اور اقبال نے بھی ڈائرکٹر تعلیم کو سورج سے بڑھ کر قرار دیا گیا تھا مگر سب سے بڑھ کر عرفی پن یہ تھا کہ بڑی صفائی سے پورے قصیدے کی تان اپنے نام پر لا کر توڑی تھی:

بڑھے جہان میں اقبال اِن مشیروں کا
کہ اِن کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر

اُنہی دِنوں ٹکسالی دروازے میں کسی دینی مدرسے کا طالب علم کوئی بوسیدہ کتاب دِکھا کر اپنی مذہبی تعلیم کے لیے خیرات مانگ رہا تھا جب بھاٹی دروازے کی جانب سے شلوار قمیض اور کوٹ میں ملبوس ایک صحت مند راہگیر کو آتے دیکھ کر اُس کی طرف بڑھا مگر اُس کی بدقسمتی سے یہ اقبال تھے۔ اُنہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک تقریر کر دی جس کا خلاصہ تھا کہ اُنہیں ایسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں جو دُوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر جینا سکھائے۔[۵۳]

ایک اور شام دہلی دروازے کی طرف جاتے ہوئے خود ہی کسی مولانا سے اُلجھ پڑے جو انگریزی کے خلاف وعظ کر رہے تھے۔ شاید ایک آدھ چلتا ہوا فقرہ بھی کس دیا جس کی وجہ سے اُن کے منہ سے جھاگ بہنے لگا اور یہ کافر قرار پائے۔ چنانچہ دونوں واقعات ڈپٹی نذیر احمد کی پچھلے برس والی نظم کے قافیے میں لکھ ڈالے اور عنوان 'دین و دنیا' رکھا۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

شعر کی پختگی کے اعتبار سے اِس میں دِل کا غبار نکالنے کے سوا کچھ نہ تھا اور معیار پست تھا:[۵۴]

اِن سے پوچھو، ہند ہی کیا رہ گیا ہے آپ کو
اور بھی تو دیس ہیں آخر جہاں آرام ہے
باندھیے بستر کہ اِن وعظوں کی خاطر سامنے
اِنڈیمن ہے، چین ہے، جاپان ہے، آسام ہے

دراصل ایک گہرے خیال کا تعاقب شروع کر رکھا تھا یعنی دین و دنیا الگ نہیں اور اُن کا باہمی تعلق اسرار سے خالی نہیں ہے۔ مشرق رُوح کے نام پر دُنیا کو نظرانداز کرتا تھا اور مغرب میں دُنیا کی خاطر رُوح غیر ہوئی جا رہی تھی۔ ''ایسی دنیا ہو تو نورالدین لنگارام ہے۔'' چنانچہ جن خیالات کا اظہار اقبال کرنا چاہتے تھے ان کا نمونہ مشرق میں تھا نہ مغرب میں بلکہ انہیں خود دریافت کرنا تھا جو ایک دن کا کام نہ تھا۔

منشی محبوب عالم نے نظم دیکھی تو چھاپنے سے معذرت کر لی۔ 'نالہ یتیم' سے اب تک پہلا موقعہ تھا کہ انجمن کے اجلاس کے لیے اقبال کی نظم پیسہ اخبار کے مطبع سے نہ چھپے۔ آخر صدیقی پریس کے محی الدین نے چھاپی جو اقبال کے کالج کے زمانے کے دوست اور دینی کتابوں کے ناشر تھے۔ اب ایک شعر منشی محبوب عالم کی ہجو کا بھی شامل تھا:

آج کل لوگوں میں ہے اِنکار کی عادت بہت
نام محبوبانِ عالم کا یونہی بدنام ہے

درجن بھر اشعار محی الدین کی تعریف میں پریس میں بیٹھے بیٹھے سپردِ قلم ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی شامل ہوئے۔[۵۵]

۳۴

انجمن حمایتِ اسلام کا سترہواں سالانہ اجلاس جمعہ ۲۱ فروری کو شروع ہوا۔ اُس روز دو نشستیں ہوئیں۔

اگلے روز دن کے جلسے کی صدارات خان بہادر علی خاں ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے کی جبکہ لفٹنٹ گورنر اور ڈائرکٹر تعلیم مہمانانِ خصوصی تھے۔ اقبال نے قصیدہ پڑھا۔

رات کو پانچویں نشست میں 'دین و دنیا' اپنے مخصوص ترنم میں سنائی۔ پرانے خیال کے لوگ ناراض ہو گئے۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اگلے روز اقبال نے کسی نہ کسی طرح اُن کی بدگمانی دُور کر دی۔ اُس روز نشست کی صدارت نظام الدین سب جج راولپنڈی کر رہے تھے۔ اقبال نے 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے' سنائی تو کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بکیں اور قیمت دس روپے تک پہنچی۔ آخر میں جنابِ صدر نے کہا، "شیخ صاحب کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے۔ آپ پنجاب کے ملک الشعرا ہیں۔"

اگلے روز انجمن کی روداد میں 'دین و دنیا' کے بارے میں لکھا گیا، "اِس نظم سے بعض صاحبوں کو محض اُن کی اپنی خوش فہمی کی وجہ سے کچھ بدگمانی اور ناراضی سی پیدا ہوئی حالانکہ اِس نظم میں چند واقعات کا ذکر ہے جو شیخ صاحب کو پیش آئے۔ تاہم شیخ صاحب نے نہایت دُور اندیشی اور دانائی سے اِس بدگمانی کو دُوسرے دن رفع کر دیا جس سے سب صاحب خوش ہو گئے۔"[۵۷]

۳۵

پنجاب کا ملک الشعرا کہلانا خوب تھا جب پہلے ہی اہلِ زبان کی طرف سے طعنے مل رہے تھے!

نہ یہ دِلّی کی اُردو ہے نہ یہ پورب کی بولی ہے
زباں میری ہے اے اقبال! بولی دردمنوں کی[۵۸]

۳۶

'دین و دنیا' سے زِک اُٹھانے والوں میں صرف وہی نہ تھے جن پر اقبال نے چوٹ کی تھی۔ موچی دروازے میں اقبال کے دوست حکیم غلام نبی طبابت کرتے تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ ایک شعر میں اُن پر بھی طنز ہُوا ہے۔ اقبال کو تردید کرنی پڑی۔[۵۹]

۳۷

شہیدِ جستجو ہے فکرِ انساں بزمِ ہستی میں
یہ کس اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی باتیں ہیں؟

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِس غزل کے آٹھ شعر دستیاب ہیں۔[۶۰]

۳۸

خدنگِ نظر لکھنؤ والوں کو اقبال کی قدر ہوئی یا شیخ عبدالقادر کو خود ہی خیال آیا بہرحال وہ مضمون لکھا جا رہا تھا جو اقبال کے بارے میں سوانحی اور تنقیدی تحریروں کے ختم نہ ہونے والے سلسلے میں فوق کے تعارفی نوٹ کو چھوڑ کر پہلی تحریر تھی۔ شیخ عبدالقادر کے نزدیک اقبال کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے فلسفہ، ویدانت اور مشرق و مغرب کی کئی زبانوں اور اُن کے ادب سے براہِ راست استفادہ کیا تھا جس کا اثر اُن کی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔

اقبال کے شجرۂ نسب کے بارے میں شیخ عبدالقادر کی معلومات وہی ہوں گی جو انہیں اقبال اور فوق نے فراہم کی ہوں گی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت خود اقبال کے گھر والوں کے پاس دُرست معلومات نہ تھیں مثلاً شیخ عبدالقادر کو بتایا گیا کہ اقبال کے خاندان میں جس بزرگ نے اسلام قبول کیا اُن کے پوتے کسی سید کو پنجاب کی سیر کروانے پنجاب آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے جبکہ شیخ نور محمد کے والد جو اپنے بھائیوں کے ساتھ پہلے پہلے پنجاب میں آباد ہوئے وہ بابا لول حج کے پوتے نہ تھے بلکہ کئی پشت بعد آئے تھے۔ اُن کے پنجاب آنے کا سیدھا سادا سبب جو بتایا جا رہا تھا وہ کہانی بھی اقبال کے خاندان میں رائج رہی ہو گی۔

ابتدائی زمانے کا وہ 'دوست' جس کی وفات نے اقبال کی شاعری میں درد و گداز پیدا کر دیا تھا عبدالقادر اُس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتے تھے اور ڈھکے چھپے الفاظ میں لکھ رہے تھے۔ یہ بھی لکھ رہے تھے کہ شادی کے معاملے میں اقبال زیادہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوئے۔ اقبال کی اجازت کے بغیر ایک دوست ایسی بات شائع نہیں کروا سکتا تھا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک ازدواجی اُلجھنیں اِتنی بڑھ چکی تھیں کہ اُنہوں نے رسالے میں تذکرہ کرنے کی اجازت دے دی:

کب ہنسا تھا جو یہ کہتے ہو کہ رونا ہو گا
ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہو گا[۶۱]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۳۹

غزل

دِل کی بستی عجیب بستی ہے
لُوٹنے والے کو ترستی ہے
ہو قناعت جو زندگی کا اُصول
تنگ دستی فراخ دستی ہے!
تابِ اظہارِ عشق نے لے لی
گفتگو کو زباں ترستی ہے
دیکھیے کیا سلوک ہو اقبالؔ
مجرمِ جرمِ بت پرستی ہے

مخزن، مارچ ۱۹۰۲ء

اِس غزل کے نو شعر دستیاب ہیں۔[۶۲] دوسرے شعر سے ذہن سالکؔ کے ایک شعر کی طرف جاتا ہے جو اُن دنوں بہت مشہور تھا:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

۱۹ مارچ کو پنجۂ فولاد میں 'زبانِ حال' کے عنوان سے 'اسلامیہ کالج کا خطاب مسلمانوں سے' شائع ہوئی۔[۶۳]

۴۰

اقبال گورنمنٹ کالج میں اِس دفعہ بھی مستقل نہ ہو سکے۔ اسسٹنٹ پروفیسری مارچ میں ختم ہوئی اور واپس اورینٹل کالج آنا پڑا جہاں اسٹراٹن صاحب کالج میں نئی روح پھونکنے کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۴۱

نشے میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
وہ وعظ اپنا کہے جائے ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کے ''گناہ گار ہوں میں''

اس غزل کے دس اشعار دستیاب ہیں۔[۶۴]

۴۲

نواب حبیب الرحمٰن شروانی اُس برس انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوئے۔ بھیکم پور کے رؤسا میں سے تھے۔ شبلی کی المامون پر تنقید سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور پھر ندوۃُ العلماٗ کے جلسوں میں ''علمائے سلف'' اور ''نابینا علماٗ'' وغیرہ مقالوں سے انہوں نے اپنی مستقل حیثیت قائم کر لی۔ ان کا ذاتی کتب خانہ مخطوطات اور مطبوعہ کتب کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔

انہیں اشعار سنانے میں اقبال کو خاص لطف آنے لگا۔ یہ شیخ عبدالقادر کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے لہٰذا جب تک لاہور میں رہے شعر و سخن کی محفلیں جمتی رہیں۔[۶۵]

۴۳

۳۱ مارچ کو کالج کی سالانہ رپوٹ میں درج کیا گیا کہ اقبال نے واکر اور سٹبز کی کتابوں کے تراجم مکمل کر لیے ہیں اور اب علم الاقتصاد پر نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ اپنی کتاب!

ان کے عہدے کی معیاد ختم ہو چکی تھی چنانچہ انہوں نے توسیعِ میعاد کے لیے درخواست گزاری۔ کالج کے افسران اُن کی خدمات کو قیمتی سمجھتے تھے لہٰذا امید تھی کہ شاید مزید دو سال کی توسیع مل جائے گی اور اس کے بعد یا اسی دوران محکمۂ تعلیم میں کوئی اچھی ملازمت بھی۔[۶۶]

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۴۴

پچیس برس کی عمر میں ایک مکمل علمی تصنیف کا مالک بننا بڑا خوبصورت خیال تھا۔ خاص طور پر اُس صورت میں جبکہ تین مقالے اس سے پہلے ہی میزان میں داخل ہو چکے ہوں۔

علم الاقتصاد پر اپنی کتاب کے لیے اُنھوں نے واکر کی پولیٹیکل اکانومی کو سامنے رکھتے ہوئے بعض دوسری تصانیف سے بھی استفادہ کیا تھا مثلاً مارشل کی پرنسپلز آف اکنامکس۔ اقبال کے سابقہ اُستاد لالہ جیارام اور ہم جماعت فضل حسین نے اُنہیں "نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورے بھی دیئے۔" اس کتاب کی زبان وہی اُردو تھی جو اُس عہد میں ایک ادبی زبان سے علمی زبان بننے کے عمل میں تھی۔ اور کتاب کی زبان پر اقبال اتنی ہی محنت کر رہے تھے جتنی اپنی غزلوں کی زبان پر کیا کرتے تھے۔ اُردو کو سنوارنے کا جذبہ جو اُس دور میں عام تھا اِس نثر پارے کی تخلیق مین وہ بھی کسی نہ کسی حد تک کارفرما رہا ہوگا۔ "میں اہلِ زبان نہیں ہوں،" اقبال نے لکھا۔ "جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔"[۶۷]

زبان میں اُنھوں نے جو تجربات کیے اُن میں یہ تجربہ بھی شامل تھا کہ جس طرح انگریزی میں فعل labour فاعل یعنی labourer کے معانی میں استعمال ہوتا تھا انھوں نے اُردو میں لفظ "محنت" محنت کش کے معانی میں استعمال کیا، "جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اُردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اِس لطیف محاورۂ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے!"

اصطلاحات کا معاملہ ٹیڑھا تھا۔ اقبال نے بعض اصطلاحات خود وضع کیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے حاصل کیں۔

علم الاقتصاد

دیباچہ

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پر ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع

دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج، اس کے اوضاع واطوار اور اُس کے طرزِ زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے۔ بلکہ اسکے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں اصولِ مذہب بھی انتہا درجہ کا موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی رُوح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدّنی لحاظ سے اس کا وجود وعدم برابر ہو جاتا ہے، معلّمِ اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لیے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لیے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے۔ اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحہ عالم سے حرفِ غلَط کی طرح مِٹ جائے؟ اِس سوال کا جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں۔ کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے جن کو معلوم کرنے لیے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر اُن واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ بالخصوص اہلِ ہندوستان کے لیے تو اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز اُن تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنے تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں اُن کا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

مہاراجہ بڑودہ نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے۔ پس اگر اہلِ ہندوستان دفترِ اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں۔ میری غرض اِن اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کروں اور نیز بعض بعض جگہ پر اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فردِ واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔

اس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ زبان اور طرزِ عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہلِ زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اُردو زبان میں اس متین طرزِ عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر باِمذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانۂ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اُردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سرمایہ سرمایہ داروں کے معنوں میں یا محنت محنتیوں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو باِمذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اُردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورۂ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب، دستکاری اور محنت، دستکار اور محنتی، نفع اور منافع، ساہوکار اور سرمایہ دار، مالک و کارخانہ دار مرادف استعمال کیے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار کا استعمال ایک باریک

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

فرق کوظاہر کرتا ہے۔ یعنی پیدائش سے مراد فعل کی ہے۔ اور پیداوار سے مراد نتیجہ فعل کی۔ علیٰ ہذاالقیاس لفظ تبادلہ اس جگہ استعمال کیا ہے جہاں ایک شے دوسری شے کے عوض میں دی جائے۔ عربی زبان میں مبادلے کا یہ مفہوم لفظ مقائفہ سے ظاہر کیا جاتا ہے، مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ہے، اس واسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔

اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جن کے فیضان صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی اے کینٹب بیرسٹرایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مسورات بھی دیے۔ اس کے علاوہ مخدوم ومکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی۔

اقبال[۶۸]

فہرست مضامین

دیباچہ

حصہ اول: علم الاقتصاد

۱۔علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق

حصہ دوم: پیدائش دولت

۲۔زمین

۳۔محنت

۴۔سرمایہ

۵۔کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے

حصہ سوئم: تبادلۂ دولت

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۶۔مسئلہ قدر

۷۔ تجارت بین الاقوام

۸۔زرِنقد کی ماہیت اوراس کی قدر

۹۔حق الضرب

۱۰۔زرِکاغذی

۱۱۔اعتباراوراس کی ماہیت

حصہ چہارم: پیداوارِ دولت کے حصہ دار

۱۲۔لگان

۱۳۔سود

۱۴۔منافع

۱۵۔اجرت

۱۶۔مقابلۂ ناکمل کا اثر دستکاروں کی حالت پر

۱۷۔مال گذاری

حصہ پنجم

۱۸۔آبادی وجہ معیشت

۱۹۔جدید ضروریات کا پیدا ہونا

۲۰۔صرفِ دولت

۴۵

ڈاکٹر وانٹ برجنٹ صاحب نے، جنہیں مشرقی زبانوں کے ساتھ خاص دلچسپی تھی، انگریزی زبان میں ایک مختصر مضمون اُردو پر لکھا تھا۔ کسی موقعے پر اُنھوں نے اقبال کو اس کی کاپی تحفتاً پیش کی۔[۶۹] اس مضمون کے مطابق اُنیسویں صدی میں اُردو نثر کی ترقی کے تین بڑے قومی سبب ہوئے۔ پہلا چھاپہ خانہ کا عام ہونا۔ دوم، انگریزی میں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تعلیم (جس کا آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا تھا) جس کے بارے میں بر جنٹ صاحب کا خیال تھا کہ ہندوستان کی کوئی زبان اِس مغربی اثر سے اِس قدر متاثر نہیں ہوئی جس قدر اُردو ہوئی تھی۔ تیسرا اہم سبب فارسی کے بجائے اُردو کا درباری زبان قرار دیا جانا تھا۔ ''اِس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیانی ممالک کو اُردو کے زیرِ نگین کر دیا ہے اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دارالخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا اِس واسطے (اُردو) کی ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الہ آباد قرار پا گئے ہیں۔''

عبدالقادر نے اقبال سے درخواست کی کہ اس مضمون کو مخزن کے لیے ترجمہ کر دیں۔

۴۶

ہم اپنی دردمندی کا فسانہ
سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے[۴۷]

اقبال کے بارے میں شیخ عبدالقادر کا مضمون خدنگِ نظر (لکھنؤ) کے مئی کے شمارے میں شائع ہوا۔

اقبال

چند سال پہلے لاہور میں ایک بزمِ مشاعرہ قائم تھی اور پنجاب کے اکثر نامور شعرا اس میں غزلیں کہہ کر لاتے تھے اور دادِ سخن پاتے تھے۔ کچھ کہنہ مشق حضرات بھی تھے جو دہلی یا لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے یا اساتذہ دہلی سے مستفید ہو چکے تھے۔ کچھ نو آموز تھے جو ان حضرات میں سے کسی نہ کسی کے معرّف تھے۔ مشاعرہ کیا تھا سخن وروں کا ایک خاصہ دنگل تھا۔ پہلے تلامذہ غزلیں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کے استادوں پر کوئی چوٹ کر جاتے تھے اور اپنے اپنے استاد کو بڑھا جاتے تھے۔ پھر استادوں کی نوبت آتی تھی۔ وہ بھی حریفوں کو پہچانتے تھے اور باہمی اشارے کنایہ سے رک نہ سکتے تھے۔ یہ دل لگی شاعری کو تو ڈبو رہی تھی مگر مشاعرہ کے باعثِ فروغ تھی۔ تماشائی جوق در جوق آتے تھے اور گھنٹوں یہ تماشا دیکھتے رہتے تھے۔ اس گروہ میں کبھی کبھی ایک کثیر تعداد سرکاری کالجوں کے طلبہ کی آ جاتی تھی۔ ان میں سے اکثر انگریزی تعلیم کی وجہ سے ایشیائی شاعری کے مذاق سے نا آشنا ہوتے تھے مگر تقضائے سِن تھا کہ ایسے مشغلے کو دلچسپ سمجھیں۔ آتے تھے اور اپنے اپنے دوستوں کو بلا لاتے تھے۔ ایک دن مقابلہ سخن گستری حدِ جدال پر

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

پہنچنے کو تھا کہ اچانک طلبہ کے گروہ میں سے ایک نوجوان اٹھا۔ عمر بیس سے کچھ متجاوز ہوگی۔ رواجِ وقت کے مطابق داڑھی چٹ، مونچھیں بڑھائی ہوئی، لباس نئے اور پرانے فیشن کے بین بین۔ سیدھا اُس کرسی کی طرف بڑھا جس پر بیٹھ کر شعرا غزل خوانی کرتے تھے اور بیٹھتے ہی مطلع پڑھا:

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے

مطلع کا پڑھنا تھا کہ کئی سخن آشنا کان متکلم کی طرف لگ گئے اور کئی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ مشاعرہ میں یہ رسم تھی کہ دبیرِ مجلس ہر سخن ور کی تعریف کر کے اُس سے حاضرین کی شناسائی کرا دیتا تھا مگر اس نوجوان منچلے شاعر سے خود دبیرِ مجلس ناواقف تھا۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ پہلے حضرت کی تعریف تو فرمائیے۔ نوجوان شاعر نے کہا، ”لیجیے میں خود عرض کیے دیتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ خاکسار کو اقبال کہتے ہیں اور یہی میرا تخلص ہے۔ سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں اور یہاں کے سرکاری کالج میں بی اے کی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ حضرت داغؔ سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ یہاں کے کسی بزرگ سے نہ خصوصیت ہے نہ خصومت۔ چند شعر لکھ کر لایا ہوں، اگر اجازت ہو تو پڑھ سناؤں۔“ مختلف آوازیں آئیں کہ فرمائیے۔ اور ہمارے نوجوان شاعر نے غزل کے باقی شعر پڑھنے شروع کیے۔ قریب قریب ہر شعر پر بیساختہ داد ملی یہاں تک کہ اِس شعر پر پہنچا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مرزا ارشدؔ گورگانی دہلوی تشریف رکھتے تھے۔ بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھے اور بولے ”میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر!“ اور واقعی اس رنگ کی کہنے والے کی عمر اور وضع سے توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ غرض اس طرح غزل ختم ہوئی اور مقطع میں شاعر نے دہلوی اور لکھنوی پارٹی کے جھگڑے پر اپنے خیال کا اظہار نہایت خوبی سے کر دیا اور اِس میں شک نہیں کہ اِس جھگڑے کے متعلق اہلِ پنجاب کا جو دونوں مقامات کے اصحابِ فن کے خرمن کے خوشہ چیں ہیں یہی مسلک ہونا چاہیے۔ مقطع یہ تھا:

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے سخن دانوں کو اس ابھرتے ہوئے شاعر سے شناسائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد کبھی کبھی مشاعرہ ہوتا رہا اور سخن فہم حضرات اقبال کی غزلوں پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے رہے لیکن کچھ تو رفتہ رفتہ مشاعرے کی گرم بازاری نہ رہی کچھ امتحانات وغیرہ نے کالجوں کے طلبہ کو مصروف کر دیا اور کچھ عرصے کے لیے اقبال کی طباعی کا چرچا گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ اور ان کے ملنے والوں تک محدود ہو گیا۔ پہلا عام جلسہ جس میں دوستوں کے اصرار نے اقبال کو پبلک کے روبرو کھینچ بلایا انجمن حمایت اسلام کا عظیم الشان جلسہ بابت ۱۸۹۹ء تھا جہاں اُس نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک دل گداز نظم پڑھی۔ یہ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ جلسے میں بار بار اس کے پڑھنے کی فرمایش ہوتی تھی اور اس پر یتیم خانے کے لیے چندے کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نظم نے اُس شہرت کی بنیاد رکھی جو اب اطرافِ ہند کو گھیرتی جا رہی ہے۔ اِس سے قبل خود کارکنانِ انجمن کو اُن کے نام اور جوہر سے یہاں تک ناواقفیت تھی کہ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پاس کر چکے ہیں یہ قیاس کر لیا کہ وہ نظم انگریزی فرمائیں گے اور پروگرام میں اُن کے نام کے مقابل نظم انگریزی چھاپ دیا۔ اُن کے احباب کو یہ کیفیت دیکھ کر ہنسی آئی مگر انہوں نے کہا کہ خیر لوگ خود ہی دیکھ لیں گے کہ کم از کم اِس شخص کی حالت میں انگریزی خوانی مذاقِ زبان اور علومِ مشرقیہ کے پڑھنے میں سدِّ راہ نہیں بنی، اور ایسا ہوتا بھی کیوں! کیونکہ اس کی انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی علومِ مشرقیہ کی تعلیم میں بھی پوری کوشش کی گئی تھی اور وہ ان چند آدمیوں میں ہیں جو اعلا درجے کی انگریزی دانی کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور مزید لطف یہ ہے کہ سنسکرت سے بھی ناآشنا نہیں۔

'نالۂ یتیم' کے پڑھے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاضرینِ جلسہ جس میں پنجاب اور ہندوستان کے اکثر اضلاع سے لوگ آئے ہوئے جمع تھے، اپنے اپنے ہاں اِس نظم کے اثر کو لے گئے اور اُس دن سے آج تک نہ صرف انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے پروگرام میں نظمِ اقبال ایک جزوِ ضروری بن گئی ہے بلکہ لاہور میں کوئی اور بھی عظیم الشان جلسہ بغیر نظمِ اقبال کے مکمل نہیں ہوتا۔ اپریل ۱۹۰۱ء سے رسالہ مخزن کے اجرا نے اقبال سے اخبار بین دنیا کو شناسا کر دیا ہے اور جو کلام اُن کا اِس رسالے میں شائع ہوا ہے وہ قوتِ بیان اور جوشِ سخن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی علمی معلومات کا ثبوت دے رہا ہے اور صاف بتا رہا ہے کہ کہنے والا انگریزی عربی اور فارسی علمِ ادب پر اچھا عبور رکھنے کے

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

علاوہ سنسکرت اور بھاشا کے علمِ ادب کے بھی قدر دانوں میں ہے اور اپنے کلام کو ایسا گلدستہ بنا دیا ہے جس میں مختلف گلشنوں کے پھول تربیت سے جمع کیے ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ ایسا پختہ اور وسیع مذاق پچیس چھبیس سال کی عمر میں کیونکر پیدا ہو گیا ضرورت ہے کہ شیخ محمد اقبال کی ابتدائی عمر اور تعلیم و تربیت پر مختصراً نظر ڈالی جائے۔

ہمارے خیال میں اس میں وراثت کو بھی دخل ہے اور تربیت کو بھی۔ شیخ صاحب کاشمیری الاصل ہیں اور انہیں کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے جس کی ایک شاخ اب تک وطنِ اصلی میں موجود ہے۔ خاندان کی وہ شاخ جس میں شیخ صاحب ہیں دو سو سال ہوئے مسلمان ہو گئی۔ گوت ان کی 'سیفر وٗ' ہے اور ان کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا۔ جو بزرگ اول میں مسلمان ہوئے اُن کے پوتے پنجاب میں آ کر آباد ہوئے اور اِس نقلِ مکان کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ خاندانِ سادات کے ایک بزرگ کے بیٹے کو پنجاب کی سیر کرانے کی تقریب سے یہاں آئے اور آخر یہیں کے ہو رہے:

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا

اِس حکایت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اہل اللہ سے ارادت اور مشائخ اور اولیاؑ کی نسبت حسنِ عقیدت اس خاندان کی طبیعتوں کا جزو ہو چکے ہیں اور اِسی کا نتیجہ ہے کہ شیخ محمد اقبال کے والد اگرچہ اُمّی ہیں تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور صوفیا کے اکثر حالات پر حاوی ہیں اور اُن کے اقوال اُنہیں یاد ہیں۔ یہ موروثی مذاق ہمارے نوجوان شاعر میں بھی موجود ہے اور اُس کی شاعری کا ضروری جزو بن گیا ہے۔

شیخ محمد اقبال کے زمانہ تعلیم میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں جو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہو۔ اکثر مسلمان بچوں کی طرح کچھ دنوں مکتب کی ہوا کھائی۔ پھر مدرسے میں داخل ہوئے، انگریزی شروع کی پھر کالج کے مدارج میں پہنچے اور زینہ بزینہ چڑھتے گئے۔ ہاں مدرسے میں پڑھنے اور سیالکوٹ کالج میں ایف اے کے درجے میں تعلیم پانے کے متعلق یہ جتانا ضروری ہے کہ وہاں ایک استاد مشفق کی توجہ خاص نے ان کی طبیعت اور مذاق کے بنانے میں معتدبہ حصہ لیا۔ سیالکوٹ کے اسکاچ مشن کالج کو حسنِ اتفاق سے زبانِ عربی اور فارسی کی تدریس کے لیے ایک ایسے بزرگ دستیاب ہو گئے ہیں جن کی ذات نہ صرف اس تعلیم گاہ اور شہر سیالکوٹ کے لیے بلکہ پنجاب بھر کے لیے مغتنمات سے ہے۔ نامِ نامی ان کا مولینا سید میر حسن صاحب ہے اور اعلا درجے کے بامذاق اصحاب میں ہیں۔ علم اور

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اہلِ علم کے شیدائی، ذوقِ کلام کے فدائی اور جویا۔ مولوی سید میر حسن اب تک ایسے طالب علم ہیں کہ جو ملے، جہاں ملے، جس سے ملے اور جب ملے، حاصل کرتے جاتے ہیں اور چھوڑتے نہیں۔ اِس بات کا نتیجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اُن کی صحبت سے فیض پہنچا ہے وہ کچھ بن کے نکلا ہے۔ متعدد ہندو نوجوان اِن کے شاگردوں میں ایسے ہیں جو اُردو فارسی تو خیر معمولی بات ہے، عربی زبان میں اعلا درجے کا مذاق لے کر نکلے ہیں اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں مسلمانوں سے بڑھ کر نمبر پا گئے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر کسی شاگرد کو ہونہار دیکھیں تو اُسے معمولی درسِ تعلیم تک محدود نہیں رہنے دیتے بلکہ خارج از وقتِ مدرسہ اُسے بعض دلچسپ اور مفید کتابوں پر عبور کرا دیتے ہیں۔ پس جب سید میر حسن جیسے استاد کو اقبال سا شاگرد مل گیا تو انہوں نے کوئی دقیقہ اُن جوہروں کو جلا دینے میں جو قدرت نے طبیعت میں امانت رکھے تھے اُٹھا نہیں رکھا۔ سید صاحب کا خاصہ تھا کہ باوجود خود ذوقِ شعر میں سرشار ہونے کے اکثر طلبہ کو شاعری سے روکتے تھے مگر اقبال کی طبیعت کا اندازہ اُنہوں نے شروع ہی سے کر لیا تھا اور اُس کے ذوقِ شعر کی قدرتی چہکے چپکے دیکھتے گئے اور اُس کے گھٹانے کی کوشش نہیں کی۔ شعر کا شوق تو اقبال نے بچپن سے پایا تھا۔ اس کے والد کی زبانی ایک دوست کو معلوم ہوا ہے کہ بچپن میں جو پیسے جیب خرچ کے لیے گھر سے ملتے تھے اُن کے منظوم قصے خرید لاتا تھا اور زبانی یاد کر لیتا تھا مگر سید میر حسن صاحب کے فیضانِ صحبت کے زمانے میں اِس شوق کو بیحد ترقی ہوئی۔ سید صاحب کو بے شمار اچھے اچھے شعر اساتذہ کے زبانی یاد ہیں۔ جو شعر وہ پڑھتے اقبال اُسے لکھ لیتا اور یاد کر لیتا۔ دیوانِ غالب سبقاً اُن سے پڑھا اور ''ناصر علی ہندی'' کے دلآویز فارسی شعر بھی اُسی زمانے میں نظر سے گزرے۔

امتحان انٹرنس پاس کرنے کے بعد اقبال نے جناب نواب فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغؔ دہلوی اُستاد حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ کی ٹھہرائی اور کچھ عرصے تک غزل میں اُن سے اصلاح لیتے رہے۔ جب سے نئے رنگ میں مخمس اور مسدس اور ترجیع بند لکھنے شروع کیے ہیں اُس وقت سے خود اپنی اصلاح کرنے لگے ہیں۔ گو طبیعت کی روانی بسا اوقات نہایت عجلت میں شعر زبان سے نکلواتی ہے اور کبھی اپنے شوق اور کبھی احباب کی فرمایش سے وہ قلم بند بھی ہو جاتے ہیں مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مہینوں کھٹائی میں پڑے رہتے ہیں۔ جب ذرا فرصت ملی انہیں پڑھا اور جہاں کوئی لفظ کھٹکا تھوڑی اصلاح کر دی، پھر پڑھا اور پھر کہیں کچھ کر دیا۔ کبھی بہت ضرورت محسوس ہوئی تو کسی بامذاق دوست کے سامنے پڑھ کر اُس کی تنقید سن لی اور اگر کچھ کام کی بات تنقید میں مل گئی

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تو اُس سے فائدہ اُٹھالیا۔

جس سال حضرت داغؔ سے اصلاح لینے کا سلسلہ شروع ہوا اُسی سال اقبال کی زندگی میں ایک اور واقعہ پیش آیا جسے ہمارے اہلِ ملک عموماً معمولی سمجھتے ہیں مگر جس کا ہر شخص کی زندگی پر عظیم الشان اثر پڑتا ہے یعنی اُن کی شادی ہو گئی۔ پنجاب کے ایک معزز خاندان میں اُنہیں نسبتِ فرزندی حاصل ہوئی۔ گو بظاہر یہ تعلق بہمہ وجوہ جانبین کے لیے مفید اور مناسب تھا مگر چونکہ یہاں رشتہ داریاں نوعمر لڑکوں کی استرضا کے بغیر ہی کر دی جاتی ہیں اِس لیے شیخ محمد اقبال بااعتبار شادی بہت خوش قسمت ثابت نہ ہوئے اور اِس واقعے نے طبیعت کی بشاشی اور شگفتگی کو اُداسی سے بدل دیا۔ اُنہیں ایام میں ایک پیارے دوست کے انتقال نے غم کی آگ پر اور تیل ڈال دیا اور طبیعت کا رنج اشعار سے ٹپکنے لگا اور اُس درد نے شاعری کا وہ حصہ عطا کر کے جسے گداز کہتے ہیں اقبال کو پورا شاعر بنا دیا۔ ہندوستان میں شاعری کی ستۂ ضروریہ میں لاگ یا لگاؤ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ حالی جیسے متین شاعر نے اِسے ''چیز وہ مضمون سجھانے والی'' لکھا ہے اور دیگر اساتذہ نے بھی کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی کے ساتھ لگاؤ پیدا کیا ہے اور اس سے کلام میں واقفیت اور جوش کی چاشنی پیدا کی ہے جس کے بغیر کلام پھیکا رہ جاتا ہے۔ ہمارے اقبال بھی اِس سے خالی نہ رہے۔ کسی کی شوخی کے قائل ہوئے اور کلام میں رندانہ رنگ کی جھلکیاں نظر آنے لگیں اور بہت سے معاملے کے اشعار نکلنے لگے۔ یہ رنگ اب تک باقی ہے مگر فلسفہ کا رنگ اس پر غالب آ جاتا ہے۔ طبیعت فلسفیانہ پائی تھی اِس لیے بی اے کے امتحان میں فلسفہ کا مضمون لے کر پاس ہوئے۔ بعد میں ایم اے میں بھی فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا اور اِس شوق کا زیادہ تر باعث یہ تھا کہ اس زمانے میں مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب جو علی گڑھ کالج کے مشہور پروفیسر تھے گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے آئے۔ فلسفہ دانی میں اُن کی شہرت عالمگیر ہے محتاجِ بیان نہیں اور اس شہرت نے اقبال کو بے اختیار اپنی طرف کھینچا مگر قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ شاگرد کی طبیعت یہاں بھی شفقتِ استاد کے لیے اچھا خاصہ مقناطیس ثابت ہوئی۔

جادو عجب نگاہِ خریدارِ دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے

خود آرنلڈ صاحب بھی اقبال کی تیز فہمی اور اُس کے فلسفیانہ دماغ کے معترف ہو گئے۔ اُنہوں نے اسے شاگردی کے مرتبت سے رفتہ رفتہ دوستی کے اعزاز تک پہنچا دیا ہے اور اقبال کے بہترین دوستوں اور عنایت فرماؤں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میں ہیں۔ وہ ایک دفعہ فرماتے تھے کہ ایسا شاگرد اُستاد کو محقق بنا دیتا ہے اور محقق کو محقق تر۔ کئی مسئلے دورانِ تعلیم میں ایسے آئے جن کی تحقیقاتِ مزید کی غرض سے آرنلڈ صاحب بہادر کو یورپ کے نامور فلسفہ دانوں سے خط و کتابت کرنی پڑی اور یہ خط و کتابت استاد شاگرد دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ فلسفے کے شوق کا یہ بھی نتیجہ ہوا کہ اقبال کچھ دنوں ہندو فلسفے کے مطالعے میں مستغرق رہا اور اُس نے ایک دوست کو بتایا کہ اِس فلسفے کے مطالعے سے طبیعت میں ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا اور شانتی کے معنیٰ سمجھ میں آ گئے اور اِسی سبب سے اب مذہب میں تعصب کی گنجایش نہیں رہی اور سب مذاہب کی دل سے تعظیم کرتے ہیں اور اُن کو بھلا جانتے ہیں مگر یہ بھلا جاننا اپنے مذہب کے عشق کے منافی نہیں گو میدانِ عمل میں ابھی صفِ عشاقِ مذہب میں نہیں آ سکتے۔

ایم اے پاس ہونے کے بعد شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ و فلسفہ و سیاستِ مدن کے مضامین پر لکچر دینے کے لیے مقرر کر دیے گئے۔ اِس عہدے کی میعاد دو سال ہوتی ہے۔ اب وہ دو سال ختم ہو چکے ہیں مگر افسرانِ کالج ان کی خدمات کو ایسا قیمتی سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے توسیعِ میعاد کے لیے سفارش کی ہے اور اُنہیں غالباً اور دو سال کے لیے وہاں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد یا اسی اثنا میں اغلب ہے کہ انہیں صیغۂ تعلیم میں کوئی معقول ملازمت مل جائے کیونکہ اکثر عہدہ دارانِ تعلیم کی رائے ان کی نسبت اچھی ہے اور وہ اُن سے تعلیمی خدمت لینے کے خواہشمند ہیں۔ آج کل علمی مشاغل میں انہماک ہے۔ نثر میں مضمون سیاستِ مدن پر ایک بیش بہا اور جامع کتاب زیرِ تصنیف ہے اور نظم میں عموماً انگریزی شعرا کی طرز پر معنی خیز نظمیں لکھتے ہیں جن میں سے اکثر بذریعہ مخزن اشاعت پا چکی ہیں۔ فرمایشی کلام سے بہت گھبراتے ہیں اور کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ محض فرمایش سے شعر کہہ دیں اور حقیقت یہی ہے کہ شعر وہ چیز نہیں کہ کسی کے اصرار سے ہو جائے، یہ تو طبیعت کا ایک بے اختیار جوش ہے اور دل کا ابال ہے اور پورا لطف اِسی میں ہے کہ بیساختہ زبان پر جاری ہو۔

اقبال کے حالاتِ زندگی کے اِس مختصر خاکے کو ختم کرنے سے پہلے شاید بے جا نہ ہوگا کہ اُس کے کلام پر نگاہ ڈالی جائے۔ اقبال کا کلام ابھی کمیت میں اکثر مشہور شعرا کے برابر نہیں پہنچا مگر کیفیت میں اندازِ خاص رکھتا ہے۔ اول تو بھرتی کے اشعار اس کے کلام میں کم پائے جائیں گے۔ بقول داغؔ، ع اُس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی نظر آتی ہے۔ غزل کے اکثر اشعار واقفیت کا رنگ لیے ہوتے ہیں اور تصنع ان میں بہت کم نظر آتا ہے مگر طبیعت اپنے جوہرِ اصلی مسلسل نظموں میں دکھاتی ہے گو اُن میں بعض بند مشکل پسندی کے نمونے ہیں۔ کئی سخن فہم حضرات نے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِس مشکل پسندی پر اعتراض کیا ہے اور ایک حد تک یہ اعتراض بجا بھی تھا مگر اس کا اثر اقبال کی طبیعت پر ابتدا میں اچھا نہیں پڑا۔ بجائے اس کی اصلاح کی فکر کے اس کا قصد ہوا کہ شعرگوئی ترک کر دے۔ چنانچہ ایک دو بے تکلف دوستوں کے روبرو اِس خیال کا اظہار بھی کر دیا مگر اُنہوں نے سمجھایا کہ اگر کہیں ایک شعر ایسا نکلتا ہے جس پر کوئی درست اعتراض وارد ہو سکے تو دس ایسے نکلتے ہیں جن کی خوبی کو سب مانتے ہیں اور ترکِ شعرگوئی ملک کی شاعری کو ضرررساں ہوگا اور اُسی زمانے میں دُور دُور سے دادیں آنے لگیں۔ منجملہ دیگر اصحاب کے مولینا شبلی نعمانی جیسے نکتہ رس مشہورِ عالم نے بدین الفاظ داد دی کہ "جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ آپ کو ڈھونڈیں گے۔" اِن باتوں نے اقبال کی ہمت پھر بندھا دی۔ اعتراض کا ایک حصہ جو اختیاری تھا رفع ہو جاتا ہے اور اب پہلے سے زیادہ ایسے اشعار اقبال کے قلم سے نکلتے ہیں جو زور کے ساتھ ساتھ سادگی اور سلاست کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہوتے ہیں مگر اعتراض کا ایک حصہ غیر اختیاری تھا اور وہ رفع نہیں ہوا اور نہیں ہو سکتا۔ اُردو زبان ابھی بمقابلہ انگریزی کے ابتدائی حالات میں ہے۔ انگریزی شاعری میں خصوصاً فلسفہ میں اکثر خیالات ایسے ہیں جو موجودہ اُردو الفاظ اور سیدھی سادھی ترکیبوں [...؟] کی ضرورت ہے یا ذرا پیچیدہ ترکیبوں کی اس لیے ع: اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے، ایک طرف تو شاعر اپنے سامعین کی طرف جھکے اور ان کی سطح پر اترنے کی کوشش کرے اور اس سے زیادہ سامعین اپنے مذاق کو بڑھائیں اور معلومات کو وسیع کریں۔ اس کی بلند پروازی کا تتبع کریں۔ اصل اندازہ تو کسی کے کلام کا اُس کے بعد کی نسلیں لگاتی ہیں اور اِس لیے اس کے معاصرین کے لیے موقع صحیح اندازے کا نہیں ہو سکتا مگر اتنا کہنے میں ہمیں تامل نہیں کہ جو کچھ اقبال نے اب تک لکھا ہے وہ اس اعتبار سے کہ ایک نوجوان انگریزی خوان کا کلام ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علومِ انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور جسے اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ نہیں، نہایت بے بہا ہے اور اس حصۂ ملک کے لیے جسے اب وہ اپنا وطن کہتا ہے مایۂ فخر و ناز ہے۔"[۶]

۴۷

اقبال نے احمدیت کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا۔ 'خطِ منظوم (پیغامِ بیعت کے جواب میں)' اکتالیس شعر کا قطعہ تھا جس میں احمدیت کا نام لیے بغیر اشارہ کیا گیا تھا کہ اِس کی وجہ سے مسلم قومیت میں دراڑ پیدا ہو سکتی تھی:

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
ایسے مذہب کو کیا سراہوں میں
بت پرستی تو ایک مذہب ہے
کفر غفلت کو جانتا ہُوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہُوں میں

''بھائیوں میں بگاڑ'' کا اشارہ بظاہر مرزا غلام احمد کے اِس حکم کی طرف اشارہ تھا کہ کوئی احمدی کسی غیر احمدی کے جنازے میں شریک نہ ہو مگر بھائی کون تھے؟ ظاہر ہے کہ بھائیوں سے مراد قوم تھی کیونکہ پچھلی نظم کے ساتویں بند میں اسلامیہ کالج نے خطاب کرتے ہوئے مسلم قومیت کے لیے ''عشقِ اِخواں'' یعنی بھائیوں کی محبت کی اصطلاح استعمال کی تھی۔

جس غفلت کو یہاں کفر کہا گیا وہ دین و دُنیا کو الگ کر کے قوم کے معاملے میں دھوکہ کھا جانا ہی ہو سکتی تھی جس کا ذکر پچھلی نظم کے اُسی بند میں ہوا تھا۔ مسلم قومیت کا یہ تصور سرسید کے اُس نکتے کی بازگشت تھا جو اُنہوں نے مرزا غلام احمد کے بارے میں میر حسن کو اپنے خط میں لکھا تھا۔ میر حامد شاہ نے دعوتِ بیعت میں عقلی دلائل پیش کیے ہوں گے کیونکہ اقبال نے اب عشقِ رسول کو اپنی دلیل بنایا:

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں

دل کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ اصل بات حقیقت کو سمجھنے کے بعد اُس کا براہِ راست مشاہدہ کرنا ہے یعنی وہی جو رومی نے کہا تھا کہ انسان صرف ذوقِ دید کا نام ہے۔ یہ تنہا عقل کے بس کا کام نہیں کیونکہ وہ زمان و مکاں سے وابستہ ہے جبکہ دِل اِس قید سے آزاد ہے۔ یہ مکالمہ سنوانے کے بعد شاعر نے کہا:

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں
تُو یہ سمجھے کہ دہریا ہُوں میں
اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب؟

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

سب بزرگوں کی خاکِ پا ہُوں میں
فیض اقبال ہے اُسی دَر کا
بندۂ شاہِ لافتیٰ ہُوں میں[۷۲]

یہی وسعتِ نظری اور طوفانِ نور میں غرق ہونے کی تمنا اُنہی دنوں ایک اور نظم میں بیان ہوئی جو مسدس کی صورت میں تھی اور اُس میں نو بند تھے۔ اس کا عنوان 'آفتابِ سحر' تھا۔[۷۳]

مئی میں 'خطِ منظوم' مخزن میں اور 'آفتابِ سحر' خدنگِ نظر میں شائع ہوئی۔

۴۸

جنوبی ہند میں انقلابی رہنما بال گنگا دھر تلک نے شیوا جی کے تہوار منانے شرع کیے تھے جن پر مسلمانوں کو محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی تاریخ کا مضحکہ اُڑایا جا رہا ہے۔ انتہاپسندوں کا موقف یہ نظر آتا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں جب تک وہ اسلام ترک نہ کر دیں۔

'صدائے درد' میں شاعر نے اپنے تصوّر میں گنگا کے کنارے کھڑے ہو کر یہی درد بیان کیا:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کُچھ اِسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
رُوح کا جوبن نکھرتا ہے اِسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اِس اِکسیر سے
رنگِ قومیّت مگر اِس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں
وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اِک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی

ایک ہی مَے سے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے؟[۷۴]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

یہ نظم مخزن میں جون میں شائع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک غزل بھی جس کے گیارہ شعر دستیاب ہیں:

عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قرار
چاہیے بے قرار ہونے کو[۷۵]

۴۹

اسٹراٹن صاحب کی صحت کو ہندوستان کی آب وہوا راس نہ آئی۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ جون کے آخر تک اُن کی طبیعت کافی خراب ہوگئی۔

۵۰

بارہ مولہ کشمیر کے رئیس عبدالصمد ککڑو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مقبل تخلص تھا۔ اقبال سے مراسم تھے۔
غالباً جون میں عبدالصمد کا جوان بیٹا خواجہ غلام حسن انتقال کر گیا۔ یہ غم سے اتنے نڈھال ہوئے کہ فرزند کا مرثیہ کہنے کی تاب نہ رہی۔ اقبال نے ان کی طرف سے مرثیہ لکھا:

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا
وہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا

سولہ (۱۶) اشعار کا یہ مرثیہ جولائی کے مخزن میں 'ماتمِ پسر' کے عنوان سے شائع ہوا۔[۷۶]
'خطِ منظوم' جو پچھلے ماہ مخزن میں شائع ہوئی تھی ۱۴ جولائی کو ہفت روزہ پنجہ ء فولاد میں بھی چھپ گئی۔[۷۷]

۵۱

جولائی کے وسط میں اسٹراٹن صاحب آب وہوا کی تبدیلی کے لیے کالج سے چھٹی لے کر وادیٔ کشمیر روانہ ہو گئے۔ وہاں ان کی تکالیف میں کوہستانی بخار کا اضافہ ہوگیا۔
اگست کے خاتمے تک یہ خبر لاہور پہنچ چکی تھی کہ اسٹراٹن صاحب کشمیر میں انتقال کر گئے ہیں۔[۷۸] اقبال نے اُن کی نوجوان بیوہ کے نام تعزیت نامہ لکھا:

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

"...I believe it is through Dr. Straten's influence that some people here are thinking of joining American universities, and I am one of them."

۵۲

لٹریری سوسائٹی یا انجمن اتحاد مدت ہوئی خواب وخیال ہو چکی تھی۔ ایک دن احمد حسین خاں کو اسے دوبارہ زندہ کرنے کا خیال آیا۔[۷۹] غالباً ۱۳ جون کو اعلان کیا کہ اگلی شام انجمن اتحاد کا مشاعرہ ہے۔ اِس عجلت میں بڑے شعرأ وقت نہ نکال سکے مگر لوگ خاصی بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ زور کی آندھی چلی اور بارش ہوئی جس کی وجہ سے مشاعرہ دو دن بعد تک ملتوی کرنا پڑا۔

۱۶ جون کی شام بقول پنجۂ فولاد ''صرف دو تین لڑکوں نے ہی مصرع طرح پر معمولی غزلیں پڑھیں''، مگر جیسا کہ اُس دور کا مزاج بن چکا تھا بزم میں دو سنجیدہ مضامین بھی پڑھے گئے۔ ایک مضمون تو احمد حسین کا اپنا ہی تھا۔ دوسرا مولوی ممتاز علی کا لیکچر تھا۔ دونوں کا موضوع 'تہذیبِ نسواں' تھا اور کسی منشی حامد حسین کی نظم بھی شاید اِسی پر تھی۔

۱۸ جون کو پنجۂ فولاد کے شمارے میں ایک مضمون مشاعرے کے بارے میں بھی تھا۔ لکھنے والے کا نام درج نہیں تھا مگر اِس میں تین باتیں ایسی ہیں جس کی وجہ سے اِس پر اقبال کی تحریر کا شبہ ہوتا ہے۔

اوّل، احمد حسین کی تعریف کے ساتھ ساتھ بڑی شائستگی سے اُن پر چوٹ کی گئی ہے ''جن کی ان تھک ہمت' کے باعث انجمن اتحاد دفعتاً پھر کتمِ وجود میں آ گئی... دفعتاً کا لفظ میں نے اِس لیے لکھا ہے کہ تاریخِ مشاعرہ سے دو دِن بھی پہلے نوٹس شائع نہیں کیا گیا۔'' اقبال اور احمد حسین خاں عام طور پر حریف سمجھے جاتے تھے۔

دوم، مضمون کے آخر میں تجویز پیش کی گئی تھی، ''میرے خیال میں اگر مشہور علم دوست پروفیسر آرنلڈ کو اِس لٹریری سوسائٹی کا لائف پریذیڈنٹ قرار دیا جائے تو یہ انسب ہوگا۔ عجب نہیں اگر مسٹر آرنلڈ ہی ڈاکٹر لائٹنر ثانی بن کر اِس لٹریری سوسائٹی کو مرحوم انجمن پنجاب سے بھی زیادہ بارونق کر دیں۔''

سوم، اِس تحریر میں تہذیبِ نسواں کے متعلق ملے جلے جذبات تھے۔ احمد حسین خاں اور حامد حسین کی نگارشات کی تعریف تھی، ممتاز علی صاحب کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی گئی اور آخر میں کہا گیا، ''یہ کسی قدر نامناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ مشاعرہ ہو سوسائٹی کا اور تمام وقت ایک ہی مضمون (موضوع) پر صرف کیا جائے۔''

تہذیبِ نسواں کے معاملے میں اقبال کی رائے اُلجھی ہوئی تھی۔ وہ عورتوں کے بعض حقوق کے حامی تھے جو اُن کے خیال میں اسلام نے عورتوں کو عطا کیے تھے مگر عورتوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح کے لیے جو عام تحریکیں شروع ہوئی تھیں اُن سے بیزار تھے۔ پنجاب میں سب سے سرگرم تحریک کے مبلّغ مولوی ممتاز علی تھے جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں بھی رہ چکے تھے اور ان کی کتاب حقوقِ نسواں کے مسودے کو سرسید احمد خاں نے اِن کے سامنے پرزے پرزے کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ یہ اب لاہور سے رسالہ تہذیب نسواں عورتوں کے لیے اور پھول بچوں کے لیے شائع کرتے تھے۔ اقبال ان کا ادب کرتے اور انہیں اپنا بزرگ مانتے تھے جس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ مولوی ممتاز علی کی بیگم اُنہی شفیع احمد صاحب کی بیٹی تھیں جو غدر کے بعد سیالکوٹ آئے تھے اور جن کی مدد سے مولوی میر حسن نے اپنی اُردو صاف کی تھی مگر اِس قریبی تعلق کے باوجود اقبال کے لیے ممتاز علی کی تحریک سے ہمدردی محسوس کرنا ممکن نہ تھا۔

بہت دنوں پہلے سرسید نے جو بات مولوی ممتاز علی سے کہی تھی وہ اُس زمانے کے اکثر مسلمان مردوں کے احساسات کی ترجمانی کرتی تھی۔ مولوی صاحب کی کتاب رَد کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا، ''ممتاز علی! ہماری حکومت چھن گئی۔ ہماری تہذیب مٹ گئی۔ اب کیا ہماری عورتیں بھی ہمارے قبضے سے نکل جائیں گی؟''[۸۰]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

باب ۸

سورج کے سامنے

۱۹۰۲ء

۱

برہمن سے شکایت کی صورت میں ایسے مسلمان کے احتجاج کی کیا صورت ہوتی جس کی اپنی رگوں میں برہمن خون تھا اور جو ہندو کو مشرک نہیں سمجھتا تھا؟

اقبال نے رِگ وید کے گایتری منتر کا ترجمہ کیا جس کے لیے غالباً دی سسٹم آف انڈین فلاسفی میں میکس مولر کی شرح بھی اُن کے مطالعے سے گزری۔[۱]

طوفانِ نور کے سامنے بیخود ہو کر جل مرنے کے استعارے انتہا کو پہنچ گئے۔

آفتاب

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گاتیری کہتے ہیں۔ یہ دعا اعترافِ عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسانِ ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اِس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علمِ ملل والنحل کے عالموں کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اِس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اِس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اِس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبانِ سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اِس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اِس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

سنسکرت میں لفظ ''سوتر'' استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اِس لفظ سے مراد اُس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے ''اللہ نور السمٰوات و الارض'' اور شیخ محی الدین ابنِ عربی فرماتے ہیں، ''اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔'' علیٰ ہٰذا القیاس۔ افلاطونِ الٰہی کے مصری پیرووں اور ایران کے قدیم انبیاً کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اِس خاص صورت میں دِقّت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو اِن کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اُردو زبان میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعراٗ ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علّت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اِس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اُپنشد میں گایتری مذکورہ کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اِس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مَین نے پوپ کا ترجمۂ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔

محمدؐ اقبال

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تُو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تُو
باعث ہے تُو وجود و عدم کی نمُود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بُود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تُو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تُو
تیرا کمال ہستی ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تُو
زائیدگانِ نور کا ہے تاج دار تُو
نَے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

مخزن، اگست ۱۹۰۲

حاشیے میں زائیدگانِ نور کی تشریح میں درج تھا، ''یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظِ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال''[۲]

۲

ستمبر کے مخزن میں وانٹ برجنٹ صاحب کے مضمون کا اقبال کا ترجمہ 'اُردو زبان' کے نام سے شائع ہوا۔[۳]

ادارتی نوٹ میں لکھا تھا، ''اِس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کے بانکپن نے مغربی فضا کو بھی اپنا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

گرویدہ کرلیا ہے۔"

گرامی کی بیگم اقبال بیگم ترکؔ صاحبہ کا نعتیہ کلام بھی شائع ہوا جو گرامی کے ذریعے مخزن کو ارسال کیا گیا تھا:

سرخرو عرصۂ محشر میں کیا ہے اے ترکؔ
امتی کہ کے رسولِ عربی نے مجھ کو

۳

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

اِس غزل کے چار اشعار دستیاب ہیں۔[۴]

۴

خواجہ مسیح پال سیالکوٹ کے ایک مقامی عیسائی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر ۱۸ برس تھی۔ امیںؔ اور حزیںؔ کے تخلص کے ساتھ شاعری کرتے تھے۔ اُن کی ایک غزل 'پیامِ یار' (لکھنؤ) میں چھپی۔ اصلاح لینے کا خیال آیا تو اقبال سے ملے اور اصلاح لینے کا خیال ظاہر کیا۔

"شاعری خداداد چیز ہے،" اقبال نے جواب دیا۔ "اگر شعرگوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشقِ سخن کیے جایئے اور اساتذہ کا کلام ضرور پڑھیے تاکہ کان بحروں سے واقف ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔"[۵]

سچی بات یہ ہے کہ اقبال کو شاعری میں شاگرد پالنے کے تصور ہی سے وحشت ہوتی تھی۔

۵

میں مشتِ خاک، مجھ میں گوہر نہاں ہے کیسا؟
حیرت ہے مجھ کو یارب! ظلمت میں نور کیوں ہے؟

اِس غزل نما حمد کے چھ شعر دستیاب ہیں۔[۶]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۶

منشی سراج الدین نے کشمیر سے چار انگوٹھیاں بھیجیں۔ کشمیر ریذیڈنسی میں میر منشی تھے اور اقبال کے خاص دوست۔ اِنہوں نے ۲۳ اشعار کا دوغزلہ لکھا، 'شکریہ انگشتری' جس میں غالب کی 'چکنی ڈلی' والے اشعار کی جھلک موجود تھی۔ درمیان میں قافیے بدل کر اُردو سے فارسی میں آ گئے: ہند سے جاتی ہے سُوئے اصفہاں انگشتری!

''ڈیر سراج''، خط میں لکھا۔ ''دو تین روز سے طبیعت بسبب دورۂ درد کے علیل ہے۔ یہ چند اشعار قلم برداشتہ آپ کے شکریے میں ارسال کرتا ہوں۔ میرا ارمغاں یہی ہے۔ اسی کو قبول کر کے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند دسطور اُردو میں لکھ کر مخزن میں بھیج دیجیے۔''

سراج نے اشعار مخزن کو نہیں بھجوائے بلکہ اُنہیں اقبال ہی کی تحریر میں خط سمیت اپنی بیاض میں محفوظ کر لیا۔[۷]

۷

اکتوبر میں اقبال کو دوبارہ گورنمنٹ کالج میں قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کا موقع ملا۔ اِس دفعہ اُن کا تقرر شعبۂ فلسفہ کی بجائے انگریزی میں ہوا تھا۔

آرنلڈ اُن دنوں اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے کیونکہ مسٹر اسٹراٹن کے بعد سے یہ آسامی خالی تھی۔

۸

زوردار قسم کی آمد کا سلسلہ مدت سے بند تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا۔

''ایک رات جب وہ بستر پر لیٹے ستاروں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے، اشعار کی آمد یکایک شروع ہو گئی،'' اقبال کے ایک ملنے والے کا بیان ہے۔ ''اشعار تھے کہ اُمڈتے چلے آ رہے تھے۔ اس کے بعد پھر کبھی یہ سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ حالانکہ وہ اس کے لیے نہ تو کوشش کرتے تھے اور نہ انہیں پہلے سے علم ہوتا تھا، مگر شعر برابر ہوتے رہتے تھے۔''[۸]

کبھی شمع سے پوچھا تھا کہ پروانہ اُس سے پیار کیوں کرتا ہے۔ رُوح کے اپنے حقیقی وطن سے دُور ہو کر سوداگر کے طوطے کی طرح جسم کے پنجرے میں قید ہونے کے استعارے اکٹھے ہوئے تو شمع کو خبر دی کہ جواب مل گیا ہے

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اور یہ جواب وہی ہے جو منصور حلاج کی زبان سے بھی ادا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے کہا تھا ''انا الحق''، جس کا مطلب خواہ کچھ بھی رہا ہو مگر بعض لوگ سمجھے کہ منصور کہتے ہیں، ''میں خدا ہوں!'' منصور کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔

اِس قصے سے عبرت حاصل کر کے اقبال نے اپنے دل کا مطلب استعاروں میں چھپایا جو نظم 'شمع' میں اکٹھے ہو گئے اور نظم مخزن کے حوالے کر دی گئی۔

۹

سیموئیل روجرز نے سولہ سطروں کی مختصر سی انگریزی نظم 'اے وِش' میں پہاڑوں کے دامن میں جھونپڑا بنانا چاہا تھا۔ اقبال کا تخیل مہمیز ہُوا تو اُنہوں نے تیس اشعار کی نظم میں اِس خیال کو خاصی ترقی دی۔ نظم کا نام 'ایک آرزو' رکھا۔ یہ بھی مخزن کے حوالے ہوئی۔[۹]

۱۰

خدا جانے کیا ہو گیا ہندیوں کو
کہ اِس دیس میں راج ہے دشمنی کا[۱۰]

اقبال جس مبالغے سے حضرت علیؓ کی تعریف کرتے تھے ویسے ہی جوش کے ساتھ حضرت عمرؓ کی عظمت بیان کر سکتے تھے مگر سیالکوٹ کے مولوی عبدالکریم کی طرف سے ایک نئی تکرار کا آغاز ہوا تو عشقِ رسولؐ میں ڈوبی ہوئی غزل وجود میں آ گئی۔[۱۰]

باطن کی آنکھ کھلنے کے لیے ظاہر کی آنکھ بند ہونا لازمی ہے۔ موت رُوح کو اگلی دنیا دیکھنے کے قابل بناتی ہے مگر کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جیتے جی وہ جلوہ دکھائی دے جائے جس کے لیے قیامت کا انتظار کیا جاتا ہے؟ سوال معنی خیز تھا۔

غزل

عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنّائی ہُوا
وہ سمجھتے ہیں کہ جرمِ ناشکیبائی ہُوا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میری بینائی ہی شائد مانعِ دیدار تھی
بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا
تجھ میں کیا اے عشق! وہ اندازِ معشوقانہ تھا
حسن خود 'لولاک' کہ کر تیرا شیدائی ہُوا
دیکھ ناداں! امتیازِ شمع و پروانہ نہ کر
حسن بن کر عشق اپنا آپ سودائی ہوا
بُغض اَصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو
دِق مگر اِک خارجی سے آ کے مَولائی ہُوا

یہ غزل بھی مخزن کے حوالے ہوئی۔ اِس کے ۹ شعر دستیاب ہیں۔"

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۱۱

دسمبر کا مخزن دربار نمبر تھا۔ "آج جب سب رعایائے ہندوستان ایک عظیم الشان شاہنشاہ کی تاج پوشی کی مبارک رسم منا رہے ہیں،" شیخ عبدالقادر نے مرزا محمد سعید دہلوی کے مضمون 'ابوظفر بہادر شاہ' کے تعارفی نوٹ میں لکھا۔ "ایشیائی خیالات کے موافق معلوم ہوتا ہے کہ 'دی گریٹ مغل' کے آخری یادگار کی بے نشان اور دُور از وطن قبر پر بھی اُس کو بھلائی کے ساتھ یاد کرنے سے دو پھول چڑھا دئے جائیں۔"

ص ۷۷-۷۸ پر 'شمع' اور 'ایک آرزو' اکٹھی شائع ہوئیں۔ پہلی نظم کے شروع میں شیخ عبدالقادر کا نوٹ تھا، "کلامِ اقبال اوراقِ مخزن میں ویسے تو مقبول ثابت ہو چکا ہے۔ اور لوگ اُس سے ایسے آشنا ہو گئے ہیں۔ کہ تمہید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مگر اس دفعہ حسنِ اتفاق سے ہمیں اُن کی دو ایسی نظمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جو الفاظ طرزِ ادا اور بندش میں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک تو فارسی الفاظ سے لدی ہوئی۔ نوائے اضافات کا بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے غالب مرحوم کے انداز کا نمونہ۔ آہستگی اور وقار سے چلتی نظر آتی ہے۔ اور دوسری سبکروی میں برق۔ سادہ الفاظ کا جامہ پہنے۔ اضافتوں کے زیور سے خالی۔ اپنی سادگی پر ناز کرتی ہوئی دل میں بیٹھتی جاتی ہے۔ ایک کے خیالات پیچیدہ اور دقیق کے اخذ کرنے کے لیے ذہن کو فکر سے دست و گریبان ہونا پڑتا ہے اور معانی ذہن میں آ کر دامن

چھڑائے لئے جاتے ہیں۔اور پکار پکار کر کہ رہے ہیں کہ ۔بیادر دیدگر ایں جا بود زباندانے۔غریب شہرِ سخنہائے گفتنی دارد۔اور دوسری کی سیدھی سادی آرزوؤں کی تصویریں ہیں کہ دل پر نقش ہوئی جاتی ہیں۔ایک فلسفیت اور تصوّف کے سمندر میں غوطہ زن ہے تو دوسری تصوّر کے پر لگائے کوہ و بیابان۔باغ و راغ کی سیر میں مصروف ہے۔اور جو کچھ دیکھتی ہے۔اس پر مصوّری کا افسوں پڑھ رہی ہے۔ہم ان دونوں کو اس لیے یکجا چھاپتے ہیں۔کہ مصنف کے دونو رنگوں کا اندازہ ہو جائے۔جب کئی لوگوں نے اقبالؔ کی مشکل پسندی کی شکایت کی۔تو ہم نے اس اظہارِ رائے کو اُن تک پہنچا دیا۔جو جواب انہوں نے دیا وہ یہی تھا کہ جہاں خیالات دقیق اور مشکل ہوں گے وہاں زبان کا آسان ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔اِسی بنا پر وہ مرزاؔ کی دشوار پسندی کو نہ صرف معذوری بلکہ ضرورت قرار دیتے ہیں اور یہی برہان اپنے مرغوب انداز کے حق میں رکھتے ہیں۔انہوں نے دوسری نظم میں یہ دکھا دیا ہے۔کہ آسان نویسی میں بھی بند نہیں۔گو جن مسائل کا ہجوم اُن کے دل کے گرد رہتا ہے وہ ہمیشہ آسان الفاظ کے لباس میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے:۔‘‘

۱۲

سر سید کی دُور اندیش نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ آزادی کی آخری جنگ کا فیصلہ صرف ہتھیاروں سے نہیں ہوگا۔ آج بھی کوئی اُن کے مزار کی تختی کو دل کی آنکھوں سے پڑھتا تو قوم کے مستقبل کے اشارے وہاں نظر آ جاتے۔

سیّد کی لوحِ تُربت

اے کہ زائر بن کے میری قبر پر آیا ہے تُو
اے کہ مستانہ مئے حسنِ عقیدت کا ہے تُو
اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری رُوح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اِس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اُجڑا ہوا تھا اُس کی آبادی تو دیکھ
بسکہ ہے بادِ صبا یاں کی اخوت آفریں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

یہ وہ گلشن ہے جہاں سبزہ بھی بیگانہ نہیں
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
یہ وہ نظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے
اپنے گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے
سنگِ تُربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اِس لَوح کی تحریر دیکھ
مدعا تیرا اگر دُنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دُنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے
دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
دِین کے پردے میں تُو دُنیا کا سَودائی نہ ہو
آڑ میں مذہب کی شوقِ عزّت افزائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو دِین کی خدمت نہیں
یہ تعصّب کوئی مفتاحِ درِ جنّت نہیں
راہ بر کو قافلے کے ساتھ چلنا چاہیے
کیا چلے گا کارواں جب رہ نما پیچھے رہے
ہو شرابِ حبِّ قومی میں اگر سرشار تُو

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ہو نہ اپنی عزّت افزائی کی تجھ کو آرزو
قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریں
رہ نما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں
کیا مزا رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی
اِس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی
دیکھ آوازِ ملامت سے نہ گھبرانا ذرا
عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہَوا
وہ شجر ہے عشقِ اِخواں زندگی ہے جس کا پھل
قوم کے عاشق کو چھُو سکتا نہیں دستِ اجل
عالمِ عقبیٰ میں ہے سب سے بڑی عزّت یہی
عشقِ اِخواں میں اگر مطعون ہو جائے کہیں
عشق ہر صورت میں تسکینِ دلِ ناشاد ہے
پر کہیں نالہ، کہیں شیون، کہیں فریاد ہے
خودبخود منہ سے نکل جاتی ہے ایسی نَے ہے یہ
شیشۂ دل سے اُچھل جاتی ہے ایسی مَے ہے یہ

چُوں زمینائے محبت خوردہ بودم بادۂ
تا ثریّا رفت ایں قومِ بخاک اُفتادۂ

تُو اگر کوئی مدبّر ہے تو سُن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
اپنے حق کے مانگنے میں رکھ ادب مدِّ نظر

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

چاہیے سائل کو آدابِ طلب مدِّ نظر
معنیِ رمزِ اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر
چاہیے دُنیا کو اُس ناداں کی صحبت سے حذر

آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ
صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزارہا

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تُو
ہو نہ جائے، دیکھنا! تیری صدا بے آبرو
چاہیے ہو باعثِ آرامِ جاں شاعر کی لَے
لاج اِس جزوِ نبوّت کی ترے ہاتھوں میں ہے
دیکھ اے جادو بیاں! تُو نے اگر پروا نہ کی
آبرو گر جائے گی اِس گوہرِ یک دانہ کی

از شرابِ حبِّ ہم جنسانِ خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش[12]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

باب۹

امیر کا صنم خانہ

۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۴ء

پہلا حصہ

۱

لاہور کے بالا خانوں میں کہیں ایک مغنیہ رہتی تھیں جن کا نام امیر تھا۔ عمر اکیس برس اور طوائفوں کے ایک نامور خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ بے حد ذہین اور حاضر جواب تھیں۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق اچھی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ حافظ کی غزلیں خوب گاتی تھیں اور خود بھی شاعرہ تھیں۔

اقبال نے محسوس کیا کہ وہ امیر بیگم کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

حافظ

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں کوئی ایسی دشواری ضرور آن پڑی کہ انہیں حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔[۱] اگر یہ ۱۹۰۳ء کے شروع کی بات ہے تو اُن دنوں وہ مڈل کے پرچوں کے ممتحن تھے اور ذہن اِس طرح اُلجھا ہُوا تھا کہ شعر کہنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی۔

۲

فوق کو پیغام ملا کہ انہیں اقبال نے بلایا ہے۔ ''میں دوڑا دوڑا اُن کے پاس گیا تو اقبال کو کسی قدر فکر مند پایا،'' فوق بیان کرتے ہیں۔[۲] ''میں نے فکر مندی کی وجہ پوچھی تو بولے کہ ہیرا منڈی کی مغنیہ جس کے پر سوز گانے سن کر میں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

بے حد لطف اندوز ہوا آج کل التفات نہیں کر رہی ہے۔ اب اس کا دماغ ٹھیک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اُس کی ہجو لکھّو جو اُس کو کسی طرح سے بھیج دی جائے گی۔ میں تم کو یہ زحمت اِس لیے دے رہا ہوں کہ خود ہجو نہیں لکھتا۔"

فوق مان گئے۔

۳

معلوم ہوتا ہے کہ امیر بیگم نے اقبال کو بتا دیا کہ وہ خود بھی اُن سے متاثر ہیں۔ صرف امیر بیگم کی والدہ اقبال کو پسند نہیں کرتیں جس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی اقبال دُوسرے تماش بینوں کی طرح ڈھیروں روپے نہیں لٹا سکتے تھے۔

غزل

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم
اچھی کہی شکایتِ جور و جفا کی بھی
اِتنی سی بات کے لیے محشر میں جائیں ہم
اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تُو کِس کا ناز ہے کہ تُجھے بھی اُٹھائیں ہم؟
پوچھیں گے آج سرمۂ دنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم
ہر چیز منع تو ہے ہمیں اے طبیبِ عشق!
لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم؟

غزل کے کم سے کم آٹھ شعر ہوئے جن کی ترتیب معلوم نہیں مگر یہ پانچ شعر مخزن میں دینے کے لیے منتخب کیے۔ جو رہ گئے وہ یہ تھے:

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

دشمن شبِ فراق میں ہے اپنا آپ ہی
آ جائے موت اپنی تو گنگا نہائیں ہم
ڈرتے تھے جس کے واسطے وہ بات اب کہاں؟
تُو ایک اب کہے تو تجھے سو سُنائیں ہم
اقبالؔ شعر کے لیے فرصت ضرور ہے
اِس فکرِ امتحاں میں غزل کیا سُنائیں ہم[۳]

۴

''اچھی ہجو لکھنے میں دو تین دن صرف ہو گئے لیکن ہجو مکمل ہو گئی،'' فوق بیان کرتے ہیں۔ ''میں اقبال کے پاس گیا تو وہاں یہ دیکھ کر کچھ مایوس سا ہو گیا کہ اُنہوں نے اِس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ آخر میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور میں نے عرض کی کہ میں ہجو لکھ کر لایا ہُوں۔ اقبال نے ایک پُر لطف تبسّم کر کے فرمایا، 'اب اس کی ضرورت نہیں۔ اُس کا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے!'''[۴]

۵

جنوری کے مخزن میں 'سید کی لوحِ تربت' شائع ہوئی۔ ''چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم'' والی غزل بھی شامل تھی۔ نظم کی تمہید میں درج تھا، ''تخیل کے کانوں نے سرسید مرحوم کی قبر سے وہ صدائے پُر درد سنی ہے۔ جسکی ایسے دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا توقع ہو سکتی تھی۔ خوبی یہ ہے کہ سرسید زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا۔ اسی طرح اُس کی لوحِ تربت سے وہ کلماتِ نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبعِ رسا نے اخذ کئے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں۔ اور جن سے ہر طبقہ کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں جب دہلی میں محمڈن کانفرنس کے جلسے زور شور سے ہوئے ہیں، ان کا شائع ہونا ایک لطفِ مزید رکھتا ہے:۔''

اُسی ماہ شبلی نعمانی انجمن حمایت اسلام کے کسی جلسے میں لیکچر دینے لاہور آئے۔ موضوع 'اسلام' تھا۔ اُنہوں نے مذہب اور انسانی فطرت کے ربط کے علاوہ دِین اور دُنیا کے باہمی تعلّق پر زور دیا۔

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

خیال ہے کہ اِس موقعے پر اقبال نے علم الاقتصاد کا مسودہ زبان کی اصلاح کے لیے انہیں پیش کیا ہوگا۔

۶

انجمن کا اٹھارہواں سالانہ اجلاس چند ہفتوں میں ہونے والا تھا۔ اقبال محسوس کر رہے تھے کہ نظم پیش نہیں کر سکتے۔ امتحانات کا عذر کیا۔ 'نالۂ یتیم' کے بعد پہلی بار انجمن کا سالانہ اجلاس اُن کی نظم کے بغیر ہونے والا تھا۔

۷

مخزن اور پنجۂ فولاد کے بعد 'خطِ منظوم' ہفتہ وار الحکم (قادیان) کے ۱۰-۱۷-۲۴ فروری کے نمبر میں شائع ہوگئی (۳) جس کے بعد میر حامد شاہ نے دھواں دھار جوابی نظم بھی الحکم میں چھپوائی جس میں بات یہاں تک پہنچی کہ:

میرا پابوس کیوں نہ ہو اقبال
حامدِ نائبِ خدا ہوں مَیں

۸

سوداگر کا قیدی پرندہ جب آزاد ہو کر وطن روانہ ہونے لگا تو مولانا روم نے اُس کی زبانی سوداگر کو کچھ نصیحتیں کروائیں جنہوں نے سوداگر کے دل پر بڑا اثر کیا لیکن اگر وہ پرندہ اقبال ہوتے تو اِس موقع پر پرواز کرنے سے پہلے کون سا گیت الاپتے؟ ایک غزل اِس مضمون کی ہوگئی:

کیا کہوں، اپنے چمن سے مَیں جُدا کیونکر ہوا؟
اور اسیرِ حلقۂ دامِ ہوا کیونکر ہوا؟

اِس غزل کے بارہ اشعار دستیاب ہیں۔ فروری میں خدنگِ نظر اور مخزن میں ایک ساتھ شائع ہوئی۔[۵]

۹

بلخ کے مولوی جلال الدین کو مولانا روم بننے کے لیے شمس تبریزی سے اپنی کتابیں جلوانا پڑی تھیں۔ یہ تجربہ عشق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اقبال کی زندگی میں اِس متصوفانہ عشق کا سانحہ امیر بیگم کی صورت میں رونما ہُوا۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

جنوری میں جو غزل مخزن میں شائع ہوئی تھی اُس میں وصل کی خواہش کا یہ عالم تھا کہ صدمۂ فراق ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ بہانہ عقل نے بنایا تھا۔ جس نے رُوح بنائی ہے اُسی نے رُوح کو تڑپنا سکھایا ہے لہٰذا ہجر بھی اُسی کی ادا ہے۔ یہ مجاز سے حقیقت کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔

۱۰

شیریں فرہاد کا قصہ پڑھ کر کسی کو تعجب ہوا کہ ایک اِنسان کیسے پہاڑ کاٹ کر نہر نکال سکتا ہے۔ اُس نے ایک دانا سے پوچھا تو جواب ملا، ”انسانی شخصیت میں بے پناہ قوتیں موجود ہیں جو عام طور پر زندگی کی مختلف خواہشات میں بکھر جاتی ہیں۔ جب کوئی ایک خواہش باقی آرزوؤں کو ختم کر دے تو قوت اکٹھی ہو جاتی ہے۔ پہاڑ اُس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے مگر قوّت کا اصل مصرف یہ ہے کہ عشق خود حسن بن جائے۔ فرہاد گنوار سنگتراش تھا اُس نے توانائی پتھر کوٹنے میں صرف کر دی۔ اپنے دل کو تراشنے پر توّجہ دیتا تو وہاں محبوب کا جلوہ مل جاتا۔ شیریں کو پرویز کے محل کی بجائے اپنے دل میں تلاش کرو۔“

قریب کے شاعروں میں سے غالبؔ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا:

جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

اقبالؔ گنوار سنگتراش نہ تھے۔

۱۱

۲۶ فروری کی شام امیر بیگم نے شعر کہنے کی فرمائش کی یا خود اقبال نے اُنہیں سنانے کی خواہش محسوس کی۔[۶]

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
غالبؔ

خیالات کا ہجوم ہو گیا۔ ایک نظم ذہن پر اُترنے لگی مگر عورت سے محبت کرنے کی نسبت خدا سے محبت کرنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ قیس کو لوگوں نے مجنوں کہہ کر چھوڑ دیا تھا مگر منصور سُولی پر چڑھائے گئے تھے۔ اقبال کو بھی ہونے والی نظم سے خوف محسوس ہوا، ”کوئی وہابی اِس کے بعض اشعار پر کوئی فتویٰ نہ دے دے۔“ چنانچہ تمہید میں پندرہ

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

سولہ اشعار کی غزل کہی جو ممکن ہے سِتار کی دُھن پر موزوں کی گئی ہو۔

غزل

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دِل وا کرے کوئی
منصُور کو ہُوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی سے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دِید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں اِنتہائے عشق ہوں تُو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
اَڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طُور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
ہم جانتے ہیں مِیم کے پردے میں کون ہے
ہاں بھیدیوں سے مُنہ نہ چھپایا کرے کوئی
سو سو اُمید بندھتی ہے اِک اِک نگاہ پر
مُجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی
محفل ہو، شُغلِ مے ہو، شبِ ماہتاب ہو
اور مَیں گِروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی
اقبالؔ! عشق نے مِرے سب بل دیے نکال
مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

نظم کا آغاز ہوا۔ اشعار اِس رفتار سے نازل ہو رہے تھے کہ خود قلم پکڑنا دُشوار تھا۔ "یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے۔" بعد میں اُنھوں نے اپنی اِس قسم کی کیفیت کے بارے میں کہا۔ "مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کِسے پکڑوں اور کِسے چھوڑ دوں!"

امیر بیگم یا کسی اور ہمدرد نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ آمد ہوتی رہی۔

ابرِ گہر بار

یا

فریادِ امت

دِل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اُسے لاؤں کیونکر؟
ہو چھپانے کی نہ جو بات، چھپاؤں کیونکر؟
شوقِ نظارہ یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میں نالوں سے قیامت نہ اُٹھاؤں کیونکر؟
میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اُس کو نہ مٹاؤں کیونکر؟
صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ!
یہ بھی اِک ناز ہے تیرا نہ اُٹھاؤں کیونکر؟
زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت میری
اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیونکر؟
تجھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی
زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیونکر؟
ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اِس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر؟

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنہ خُمِ دل سے اُچھل جائے گی

آسماں مجھ کو مٹا دے جو فروزاں ہوں میں
صورتِ شمعِ سرِ گورِ غریباں ہوں میں
ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو
درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں
دیکھنا تُو مِری صورت پہ نہ جانا، گل چیں!
دیکھنے کو صفتِ نو گلِ خنداں ہوں میں
موت سمجھا ہوں مگر زندگیِ فانی کو
نام آ جائے جو اُس کا تو گریزاں ہوں میں
دُور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں
یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں
کُنجِ عُزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر
یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں
داغِ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن
ہے اُسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں
ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح!
اشک بڑھ چڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں
ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں
رِند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رِند مجھے
سُن کے اِن دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اِتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں
دیکھ اے چشمِ عدو! مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہوں جس دل پہ ہے وہ دل میرا

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل
یارب اُس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی
جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعِ ہستی تو اُگا دانۂ دل
حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکہ اِس پر
کس کی منزل ہے الٰہی! مِرا کاشانۂ دل
کچھ اُسی کو ہے مزہ دہر میں آزادی کا
جو ہوا قیدیٔ زنجیرِ پری خانۂ دل

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل
تُو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اِس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اِک لغزشِ مستانۂ دل
ہائے کیا جانیے اس گھر کا مکیں کیسا ہو؟
ہوں جو منصور سے دربانِ درِ خانۂ دل
خاک کے ڈھیر کو اِکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مائل ہو کر
آنکھ کھل جاتی ہے انساں کی بے دل ہو کر
لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں، برا ہوتا ہے
عقل آئی مجھے پابندِ سلاسل ہو کر
آرزو کا کبھی رونا کبھی اپنا ماتم
اُس سے پوچھے کوئی کیا دل نے لیا دل ہو کر
میری ہستی ہی تو تھی میری نظر کا پردہ
اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عینِ ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اِس نقطے نے باطل ہو کر
خلق معقول ہے، محسوس ہے خالق اے دل
دیکھ نادان! ذرا آپ سے غافل ہو کر

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

طُور پر تُو نے جو اے دیدۂ موسیٰ! دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر

کیا کہوں بیخودیِٔ شوق میں لذّت کیا ہے
تُو نے دیکھا نہیں زاہد! کبھی غافل ہو کر

راہِ الفت میں رواں ہوں کبھی اُفتادہ ہوں
موج ہو کر کبھی خاکِ لبِ ساحل ہو کر

دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہوں
جوہرِ آئینۂ خنجرِ قاتل ہو کر

وہ مسافر ہوں چلے جب نہ پتا منزل کا
خود بھی مٹ جاؤں نشانِ رہِ منزل ہو کر

ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا
چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر

دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو، کیا معنی
آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر

عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی! توبہ
دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر

مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے
میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المدد! سیّدِ مکّی مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لاکھ سامان ہے اِک بے سر و ساماں ہونا
مجھ کو جمعیتِ خاطر ہے پریشاں ہونا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تیری اُلفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
''آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا''

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دل جو بربادِ محبت ہوا آباد ہوا
سازِ تعمیر تھا اِس قصر کو ویراں ہونا

علم وحکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا

کبھی یثرب میں اویسِ قرنی سے چھپنا
کبھی برقِ نگہِ موسیِ عمراں ہونا

قابِ قوسین بھی، دعوٰی بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اٹھانا کبھی پنہاں ہونا

لطف دیتا ہے مجھے مِٹ کے تِری اُلفت میں
ہمہ تن شوقِ ہوائے عربستاں ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا
تیرے نظّارۂ رُخسار سے حیراں ہونا

خندۂ صبحِ تمنّائے براہیم استی
چہرہ پرداز بہ حیرت کدۂ میم استی

حشر میں ابر شفاعت کا گہربار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل! تیرا خریدار آیا

پیرہن عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی
دیکھنا، دیکھنا، وہ کافرِ دیں دار آیا

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

عشق کی راہ میں اِک سیر تھی ہر منزل پر
نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اُس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہ گار آیا

وہ مری شرمِ گنہ اور وہ سفارش تیری
ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا مے خانہ عجب مے خانہ
یعنی ہشیار گیا اور میں سرشار آیا

ما عرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قابِ قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحرِ محبت کا تلاطم مجھ کو
کشتیِ نوح ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو

حسن تیرا مری آنکھوں میں سمایا جب سے
تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھ کو

تیرے قرباں میں اے ساقیِ مے خانۂ عشق
میں نے اک جام لیا تُو نے دیے خُم مجھ کو

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

خاک ہو کر یہ ملا اوج تری اُلفت میں
''کہ فرشتوں نے لیا بہرِ تیمّم مجھ کو''
گرد آسا سرِ دامن سے لگا پھرتا ہوں
حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو
کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج
حُور سے کہتا ہے، چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو!
موت آ جائے جو یثرب کے کسی کُوچے میں
میں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو
صفتِ نوکِ سرِ خار شبِ فرقت میں
چبھ رہی ہے نگہِ دیدۂ انجم مجھ کو
خوف رہتا ہے یہ ہردم کہ رہِ یثرب سے
طُور کی سمت نہ لے جائے توہّم مجھ کو
تُو نے آنکھوں کے اشارے سے جو تسکیں کر دی
شورِ محشر ہوا گلبانگِ ترنم مجھ کو
اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے حضور
چھوڑ جائے نہ کہیں تابِ تکلّم مجھ کو
ہے ابھی اُمّتِ مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بیخودیٔ شوق! نہ کرگُم مجھ کو

ہمہ حسرت ہوں، سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نُوح کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم کو آتش میں بھروسا تیرا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا
اے کہ پرَتو ہے ترے ہاتھ کا، مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا پا کے اشارہ تیرا
گرچہ پوشیدہ حسن ترا پردوں میں
ہے عیاں معنیِ لولاک سے پایا تیرا
ناز تھا حضرتِ موسیٰ کو یدِ بیضا پر
سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا
چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اَعما ہوتی
دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا
مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیرممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں اُمّتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حال اُمّت کا بُرا ہو کہ بھلا کہتے ہیں
صفتِ آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں
واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہربات کو آوازِ خدا کہتے ہیں
اُن کے ہر کام میں دُنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دُنیا کو برا کہتے ہیں
غیر بھی ہو تو اُسے چاہیے اچھا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اُسے بادِ صبا کہتے ہیں
شاہدِ قوم ہوا خنجرِ پیکار سے خوں
ہائے غفلت یہ اُسے رنگِ حنا کہتے ہیں
آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا
یہ وہ بندے ہیں اُسے فتنہ رُبا کہتے ہیں
ہو نہ اے قافلہ سالار! یہ اُمت تیری
کارواں ہند میں ہے کوئی لٹا کہتے ہیں
جن کی دیں داری میں ہو آرزوئے زَر پنہاں
آ کے دھوکے میں اُنہیں راہ نما کہتے ہیں
لاکھ اقوام کو دُنیا میں اُجاڑا اِس نے
یہ تعصّب کو مگر گھر کا دِیا کہتے ہیں
خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بِنائے ایماں
مرض الموت ہے جو اُس کو دوا کہتے ہیں
یہ نصاریٰ کا خدا اور وہ علی شیعوں کا
ہائے کس ڈھنگ سے اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
مقصدِ لِحمَك لِحمِی پہ کھلی اِن کی زباں
یہ تو اِک راہ سے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں
تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہوا اے شافعِ حشر!
میرے جیسوں کو تو کیا جانیے کیا کہتے ہیں
بغضِ للّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام
ایسے بندوں کو یہ بندے "صُلحا" کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فکرِ کفن بھی نہ جسے
یہ اُسے بندۂ بے دامِ ہوا کہتے ہیں

یہ دوا صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جانا ہو
درد کے حد سے گزرنے کو دوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیِ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

اُمرا جو ہیں وہ سنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنّا کہنا

دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے
اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

شِکوہ منّت کشِ لب ہے کبھی منّت کشِ چشم
میرا "کہنا" جو ہے "رونا" تو ہے "رونا"، "کہنا"

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے
یہ اگر راہ پہ آ جائیں تو پھر کیا کہنا

بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرماں نہ ترا اور نہ خدا کا کہنا

ہم نے سو بار کہا "قوم کی حالت ہے بری"
پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

جو مرے دل میں ہے کہ دوں تو کوئی کہہ دے گا
منہ پہ ہوتا نہیں اِن لوگوں کو اچھا، کہنا
ہم کہیں کچھ تو کہے جائیں اِنہیں کیا پروا
''کوئی'' کہہ دے تو اثر کرتا ہے کیا کیا ''کہنا''
اِن کی محفل میں ہے کچھ بار اُنہیں لوگوں کو
جن کو آتا ہو سرِ بزم لطیفا کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا شاہِ دوعالم ہو کر

اِس مصیبت میں ہے اِک تُو ہی سہارا اپنا
تنگ آ کر لبِ فریاد ہوا وَا اپنا
ایسی حالت میں بھی امید نہ ٹوٹی اپنی
نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعویٰ اپنا
فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب
ہائے اِن مالیوں نے باغ اُجاڑا اپنا
ہم تو مٹ جائیں گے معمورۂ ہستی سے مگر
صبر اِن راہ نماؤں پہ پڑے گا اپنا
تیری سرکار میں اپنوں کا گلہ کیا کیجے
ہو ہی جاتا ہے مصیبت میں پرایا، اپنا
دیکھ اے نوح کی کشتی کے بچانے والے
آیا گردابِ حوادث میں سفینا اپنا
ہم نے سو راہ اخوّت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہوا اپنا نہ پرایا اپنا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِس مصیبت میں اگر تُو بھی ہماری نہ سنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا؟
ہاں برس ابرِ کرم! دیر نہیں ہے اچھی
کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا
لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے
ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا
اب جو ہے ابر مصیبت کا دھواں دھار آیا
ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو دلِ شیدا اپنا
یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت
ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا
زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیم! اپنی
کر دُعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا
ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے اِنہیں لوگوں کی ہمّت پہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنّا تجھ سے

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے؟
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے؟
جس کی تاثیر سے ہو عزّتِ دین و دنیا
ہائے اے شافعِ محشر! وہ دوا کون سی ہے؟
جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یکرنگی کی
ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے؟

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے؟ وہ آوازِ درا کون سی ہے؟
اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی
جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے؟
سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر
اپنی امّید یہاں تیرے سوا کون سی ہے!
اپنی کھیتی ہے اُجڑ جانے کو اے ابرِ کرم!
تجھ کو جو کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے؟
ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی
آج دنیا میں وہ بزمِ فقرا کون سی ہے؟
تیرے قربان کہ دکھا دی ہے یہ محفل تُو نے
میں نے پُوچھا جو ''اخوّت کی بنا کون سی ہے؟''
راہ اِس محفلِ رنگیں کی دِکھا دے سب کو
اور اِس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو[7]

''زاہدِ تنگ نظر'' اور ''یہ نصاریٰ کا خدا'' والے اشعار میں عبدالکریم سیالکوٹی کی طرف اشارہ تھا۔

۱۲

''شعر کہنے کی کیفیت کو... جنسی تحریک سے بھی مماثل قرار دیا جا سکتا ہے،'' اقبال کا بیان ہے، ''اور حالتِ حمل سے بھی۔ جب تک میں اِس کیفیت کی تکمیل میں اشعار نہیں کہہ لیتا مجھے سکون مہیّا نہیں ہوتا اور وہ سکون (جب ملتا ہے) تکان اور ماندگی لیے ہوئے ہوتا ہے۔''[8]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۱۳

اگلی شام اقبال نے 'ابرِ گہربار' کتابت کے لیے دے دی۔

۱۴

۲۸ فروری کو پنجۂ فولاد میں اقبال کا کھلا خط امیرؔ مینائی کے شاگردوں اور احباب کے نام شائع ہوا۔ اتنے بڑے شاعر کی کوئی سوانح ابھی تک شائع نہ ہوئی تھی لہٰذا وہ خود اِس کام کا عزم کرتے ہوئے اُن کے شاگردوں اور دیگر واقف کاروں سے دریافت کرنا چاہتے تھے:

(۱) حضرت امیرؔ مینائی کی کوئی ایسی بات جس نے اُن کی زندگی یا شاعری پر کوئی خاص اثر کیا ہو۔

(۲) اُن کے زبانی مقولے

(۳) اُن کے بچپن کی بعض باتیں جن سے اُن کی آئندہ عظمت کا پتہ چلتا ہو۔

(۴) اُنہوں نے کس کس مقام کا سفر کیا اور کیوں؟

(۵) کس کس اُستاد سے کیا کیا حاصل کیا؟

(۶) اُن کی عام عادات۔

(۷) چند ایک مشاعروں کی مفصّل کیفیت۔

''یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یہ مضمون انگریزی میں لکھا جائے گا اور ولایت کے کسی مشہور اخبار یا رسالے میں چھپوایا جائے گا۔''

۱۵

یکم مارچ کو انجمن کا اجلاس ہوا۔ بعض لوگوں کے لیے یہ بات غیر متوقع رہی ہو گی کہ اقبال جنہوں نے معذرت کر لی تھی ایک نئی نظم لائے ہیں جس کی کاپیاں بھی ہمراہ ہیں۔ 'ابرِ گہربار یعنی نعتِ عاشقانۂ جنابِ سرورِ کائنات و فریادِ اُمّت برآستانۂ آں ذاتِ بابرکات۔'

بعض بند غلط ترتیب میں چھپ گئے تھے اور جلدی میں کتابت کی غلطیاں دُور نہیں کی جا سکی تھیں۔ ''طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا'' میں غلطی سے ''حضرتِ موسیٰ'' لکھا ہُوا تھا مگر یہ نظم انجمن کے جلسوں میں پڑھی جانے

والی پچھلی نظموں سے بھی زیادہ پسند کی گئی۔

یہ نظم جس نفسیاتی تجربے سے دوچار کرتی تھی وہ اِسے ایک منفرد حیثیت دیتا تھا اور یہ اقبال کی اپنی اُفتادِ طبع تھی جس کے تحت وہ نفس کی شدید ترین خواہشات کا رُخ موڑ کر اُن کی قوّت کو اپنی مرضی کے موضوع پر شعر کہنے میں صرف کر دیتے تھے۔

۱۶

امیر بیگم محض بہانہ تھیں۔ اقبال جس حسن کی محبت میں گرفتار تھے وہ خود اُنہی میں تھا۔ اِس تجربے نے صرف اُنہیں اُس کے روبرو کر دیا:

نظر جب سے تیری نظر سے ملی ہے
جسے دیکھتا ہوں وہی خوب رُو ہے
خودی نے عطا کی مجھے خودشناسی
مِرا حسن دائم مِرے رُوبرو ہے
نمایاں ہے کثرت میں وحدت کا جلوہ
جدھر دیکھتا ہُوں وہی رُوبرو ہے[9]

۱۷

ہندوستان کو غلام بنانے والے انگریز بھی پہلے پہل سوداگر کے رُوپ میں یہاں آئے تھے۔ جس طرح مولانا روم کی حکایت میں پرندہ رُوح اور اُسے قید کرنے والا سوداگر دُنیاوی ہوس تھی اُسی طرح ہندوستان کو غلام بنانے والا مغربی استعمار رُوح پر مادّے کو غالب کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔

اقبال کے پرندے میں کہانی اور روحانیت کے ساتھ ایک تیسری جہت کا اضافہ ہو گیا۔ یہ سیاست تھی اور پہلی دونوں جہتوں سے پوری طرح آہنگ تھی۔ پرندے کو اُنہوں نے طوطے کی بجائے بلبل بنا دیا۔

نظم ترکیب بند میں تھی اور اس میں اکیس شعر تھے۔ چار بند تھے۔ اقبال نے نظم کا نام 'بلبل کی فریاد' رکھا:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا[۱۰]

۱۸

تعمیر بت کیے ہوئے کعبے کی راہ میں

اِس مصرع پر گرہ نہ لگ سکی مگر اِس زمین میں پانچ شعر ہو گئے۔[۱۱]

۱۹

انجمن کے جلسوں کی وجہ سے اقبال کے دوستوں میں جو نئے اضافے ہو رہے تھے اُنہی میں سے غلام قادر گرامی تھے، جالندھر کے لاابالی مخبوط الحواس اور بلند پایہ فارسی شاعر۔

گرامی غالباً اقبال کی فرمایش پر اِس مرتبہ لاہور ہی میں ٹھہر گئے اور اُنہی کے گھر قیام کیا۔ اُن کی بیوی جن کا نام بھی اقبال تھا اور تُرک تخلّص کر کے شعر کہتی تھیں شوہر کا انتظار کرتی رہ گئیں اور یہ اقبال کے اشعار کی داد دیتے رہے۔

امیر بیگم بھی اِن محفلوں میں شریک ہو جاتی تھیں۔

حشر کو مانتا ہوں بِن دیکھے
ہائے ہنگامہ اُس کی محفل کا[۱۲]

اقبال میں چھپا ہوا شاعر جو کبھی کبھی فلسفی سے دب جاتا تھا اب غالب ہو گیا۔ وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا تھا جب اپنے پُرانے خواب کی تعبیر کے لیے متفکر نہ ہوں، ملٹن کی تقلید میں طویل نظم لکھنے کا خواب![۱۳]

۲۰

شاید یہ اقبال کی زندگی کا بہترین مہینہ تھا۔

۱۱ مارچ کو عید تھی۔ بارش ہوئی اور بےفکرے دوست گھر میں جمع ہو گئے۔ شاعری کا دور چلا۔ ایسے میں خیال آیا کہ امیر بیگم کے بغیر عید کیا ہو گی۔ فوراً عبدالقادر یا کسی اور دوست کو اُس کی طرف دوڑایا، اُس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے!

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

انتظار کے عالم میں حبیب الرحمٰن شیروانی کا نام لے کر کاغذ کھینچا اور قلم اٹھا کر خط لکھنے بیٹھ گئے۔ ''آج عید کا دن ہے اور بارش ہو رہی ہے۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے۔ شیخ عبدالقادر ابھی اُٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں...اور ابرِ گہربار کی اصل علّت کی آمد آمد ہے...ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدّت سے ہے...'' جب لکھنے کو کچھ نہ رہا تو خط میں اپنی نظمیں درج کرنے لگے۔ 'بلبل کی فریاد' درج کی۔

غرض یہ کہ اُن دنوں خوب موج میں تھے۔ ایک دن مشن کالج کے پرنسپل حاکم علی کا نوکر کسی کام سے اُن کے پاس آیا۔ ہوشیار پور کا رہنے والا اور اقبال ہی کے الفاظ میں بالکل ''جانگلو''! اُس کا نام علی بخش تھا۔

نہ جانے اُس کی کیا بات اقبال کو اچھی لگی کہ اُس سے پنجابی میں کہا، ''تم ہمارے پاس اچھے رہو گے۔'' وہ خوش ہوا مگر حاکم علی کی ملازمت چھوڑنے کے لیے کچھ دنوں کی مہلت طلب کر لی۔[۱۴]

۲۱

سیالکوٹ جانا ہوا۔ رئیس آغا باقر کے بیٹے محمد ناصر خاں کے ختنے کی تقریب میں کسی نے امیؔر مینائی کے دیوان صنم خانۂ عِشق میں سے طرح مصرع نکال کر محمد ناصر خاں کا سہرا لکھنے کی فرمایش کی۔ اُنیس اشعار ہو گئے:

گلِ مضموں سے اے اقبال! یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل تیری غزل کیا ہے کسی گل چیں کی جھولی ہے[۱۵]

۲۲

اپریل میں ناصر خاں کا سہرا اور ''ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی'' والی غزل مخزن میں شائع ہوئے۔

۲۳

لطف جب آتا ہے اقبالؔ سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

کم سے کم سترہ اشعار ہوئے جن میں سے کچھ مخزن میں بھی بھیجے مگر شعر کے موتی بن کر دل کے صدف

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

سے نکلنے کا جو مطلب اقبال کے سامنے ہو سکتا تھا اُس کی بجائے ایک دفعہ پھر داغ کا رنگ چھا گیا تھا۔[۱۶]

۲۰

۱۹ اپریل کو اورینٹل کالج میں نئے پرنسپل صاحب مقرّر ہوئے اور آرنلڈ دوبارہ گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں پہنچے۔[۱۷] توقع تھی کہ وہ اقبال کو پھر وہیں بلوالیں گے۔

۲۴

لاہور میں کوئی نوازش صاحب رہتے تھے۔ اقبال ان کے یہاں گرامی اور کسی بسمل کے ہمراہ بیٹھے تھے کہ درد قولنج کی تکلیف محسوس ہوئی جو اُنہیں اب کبھی کبھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میزبان عجیب ستم ظریف تھا کہ ایک مصرع پڑھا جس کی ردیف 'اہل درد' تھی۔ پھر فرمایش کردی کہ اِس پر کچھ اشعار کہے جائیں۔ اقبال نے 'اہلِ درد' کے عنوان سے اکتیس اشعار کا دوغزلہ کہہ ڈالا:

موجِ خونِ سرمد و تبریزی و منصور سے
کس قدر رنگیں ہے یارب داستانِ اہلِ درد![۱۸]

۲۵

اقبال کی ایک اور غزل "تو نہاں مجھ سے میرے داغِ جگر کی صورت" مخزن کے مئی کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ غزلیں اُس معیار سے بہت پست ہیں جو وہ اُس وقت تک اپنے لیے بنا چکے تھے۔ 'ہمالہ' اور 'ابرِ گہربار' کے بعد مخزن میں ایسی چیزوں کی اشاعت گوارا کی تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اندر کا شاعر اُن دنوں بیتاب تھا۔

ص ۴۶-۴۷ پر کسی شاعر کی نظم شائع ہوئی جو ولیم بارنس کی انگریزی نظم کا ترجمہ تھی۔

ماں کا خواب

جبکہ سوتے تھے گھونسلوں میں طیور

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

آدمی نشۂ خواب میں مخمور
میں بھی ظاہر میں سو رہی تھی مگر
دل میرا بن رہا تھا بقعۂ نور
دیکھتی کیا ہوں کر رہی ہوں تلاش
اپنے بچے کی آسماں پر دُور
میرا بچہ کبھی جو تھا زندہ
چھوڑ مجھ کو گیا ہے اب مہجور
ہائے میرے نہ یہ ہوئے مقسوم
میرے دل کا سدا وہ رہتا سرور
اس تجسس میں کچھ شکیل و سلیم
بچے لائن میں کرتے دیکھے عبور
سب کے ہاتھوں میں شمعیں تھیں روشن
سب کے سب تھے سفید جوں بلور
شکل ہر اِک کی صاف آئی نظر
بولنے سے مگر وہ تھے معذور
میرا بچہ بھی اپنی باری میں
گذرا قدرے اُداس میرے حضور
لیک جو شمع اُس کے ہاتھ میں تھی
روشنی آہ اُس سے تھی مفرور
مُڑ کے پیچھے یہ بولا بچہ مرا
تاکہ اندیشہ میرا کر دے دُور
”میری امّاں نہ کر تُو نوحہ گری

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تیرے اشکوں نے شمع کی کافور"

صدرالدین (از قصور)

اس نظم کے نیچے ص ۴۷ ہی پر کسی شاعر ریاض کے اشعار کا انتخاب محمد سخاوت حسین کا کیا ہوا چھپا تھا جس کا پہلا شعر تھا:

دل میں چبھ جائے وہ کانٹا چاہیئے
دل میں بس جائے وہ صحرا چاہیئے

ص ۵۵ پر یہ افسوس ناک نوٹ درج تھا: "کوئی شخص جو میر مہدی مجروح کے کلام سے آشنا ہے یا جس نے غالب مرحوم کے اس لائق شاگرد کا نام سنا ہے اس خبر کو بغیر قلق کے نہ سن سکے گا کہ اس مہینے میر مہدی اس جہاں سے اٹھ گئے..."

۲۶

مخزن میں قصور کے کسی صدرالدین کی جو نظم شائع ہوئی تھی اُسی موضوع پر ایک انگریزی نظم پہلے سے موجود تھی:

The Mother's Dream
By William Barnes

I'd a dream to-night
As I fell asleep,
Oh! the touching sight
Makes me still to weep;
Of my little lad,
Gone to leave me sad,
Aye, the child I had,
But was not to keep.
As in heaven high,
I my child did seek,
There, in train, came by
Children fair and meek.

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

Each in lily white,
With a lamp alight;
Each was clear to sight,
But they did not speak.
Then, a little sad,
Came my child in turn,
But the lamp he had,
Oh! it did not burn;
He, to clear my doubt,
Said, half-burned about,
"Your tears put it out;
Mother, never mourn."

۲۷

ماں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر، میری جاں!
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی!
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

نہیں معلوم اقبال نے یہ نظم کب لکھی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے اقبال نے ولیم بارنس سے ماخوذ یہ نظم لکھ کر

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

کہیں شائع کروائی اور پھر صدرالدین نے اپنی نظم مخزن میں بھیجی یا صدرالدین کی نظم دیکھ کر اقبال کو خیال آیا۔

اس نظم کے نو متروک اشعار جو ملتے ہیں اُن کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ اقبال کے غیر مطبوعہ کاغذات میں سے نقل کیے گئے یا اگر نظم کی کسی ابتدائی طباعت میں شامل تھے تو اقبال نے انہیں کب خارج کیا کیونکہ بہرحال ۱۹۲۴ء سے پہلے کبھی اس نظم کا ترقی یافتہ متن وجود پا چکا تھا جس میں یہ اشعار شامل نہ تھے:

کوئی اس سمے کا بیاں کیا کرے
اندھیرا خموشی بغل گیر تھے
سیاہی کا نقشہ تھا ایسا جما
اُجالا کہیں نام کو بھی نہ تھا
ستارے فلک پر چمکتے نہ تھے
کہ ظلمت کے ڈر سے تھے سہمے ہوئے

...

یکا یک دکھائی دیا چاندنا
ہوا جس سے کچھ کچھ مجھے حوصلہ
بڑی دُور تھی مجھ سے یہ روشنی
مگر رفتہ رفتہ قریب آ گئی
کہوں کیا جماعت وہ بچوں کی تھی
کہ معصومیت چلتی پھرتی ہوئی

...

جدائی کے صدمے سہوں کس طرح
جو گذری ہے مجھ پر کہوں کس طرح
پریشاں ترے غم میں رہتا ہے دل
عجب طرح کے رنج سہتا ہے دل

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اجل سے بھی بدتر ہے جینا مرا
لٹا دن دہاڑے خزینہ مرا

انگریزی نظم اور صدرالدین کی نظم سے اقبال کی نظم بالخصوص متروک اشعار کے بغیر بعض بنیادی اختلافات رکھتی ہے۔ انگریزی نظم میں ماں خواب سنانے سے پہلے ہی قارئین کو بتا دیتی ہے کہ اُس کا بچہ مر چکا ہے۔ صدرالدین کی نظم میں بچے کی موت کا تذکرہ خواب کے بیان کے بیچ میں آتا ہے مگر وہاں بھی اس پر اصرار ہے۔ اقبال کی نظم کی ابتدا ہی خواب کے بیان سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ امکان موجود رہتا ہے کہ بچہ سچ مچ میں نہ مرا ہو بلکہ ماں نے صرف خواب میں اُسے مردہ دیکھا ہو۔

یہ فرق اس لحاظ سے اہم ہو جاتا ہے کہ اقبال کے یہاں روشنی اُس علم کا استعارہ تھا جو انسان کی شخصیت بدل دیتا ہے بلکہ تصوف کی رُو سے ایک طرح کی فنا سے ہم کنار کر کے نئی شخصیت عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچے کا ان مراحل سے گزرنا بھی ماں کے خواب میں بچے کی موت کا استعارہ بن سکتا ہے۔ وہ دیا جو بچے کے ہاتھوں میں روشن نہیں تھا وہ کہیں وہی روشنی تو نہیں تھی جس کی دعا 'ایک بچے کی دعا' میں بھی مانگی گئی تھی اور جس کی بدولت 'ہمدردی' میں جگنو نے بلبل کی رہنمائی کی تھی؟[19]

۲۸

۳ جون کو آرنلڈ نے اقبال کو گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں عارضی پروفیسر مقرر کروالیا۔[20]

اُس مہینے مخزن میں شاہ دین ہمایوں کی نظم 'شالامار کشمیر' ص ۴۹-۴۷ پر شائع ہوئی:

ناظرؔ بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخؔ ہو اور شالامار ہو

۲۹

اقبال کے ہم صفیر بڑھ رہے تھے۔ دکن کے شاعر نادر کاکوروی کبھی اقبال سے نہیں ملے تھے مگر مشتاق تھے:

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کاکوروی نے دُور سے دیکھا مجھے

اقبال کی اس غزل کے اکّیس شعر دستیاب ہیں۔[۲۱]

۳۰

سجاد حیدر یلدرم نے اُس برس کسی رسالے میں تحریر کیا:

''ہمیں خوشی اور کشادہ دلی سے ماننا چاہیے کہ اُردو کو ایک نیا شاعر ملا ہے جس کی آواز ہر روز لطیف تر، جس کا نغمہ ہر آن شیریں تر اور جس کا تخیل ہر لحہ بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ تنگ دلی، یہ بچوں کا سا رشک، یہ اک شخص کی خداداد قابلیت کے اعتراف سے ابا کیوں ہے؟ اگر عندلیبِ خوش نوا دفعتہً اور بغتۃً کسی شاخِ گل پر بیٹھ کر ایسی جاں آویز اور دل گداز نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہے جو اور عنادل میں نہیں تو میں خیال کرتا ہوں (میں صرف خیال کرتا ہوں کیونکہ میں عندلیب نہیں، کاش میں مرغِ خوش الحان نہیں تو مرغِ ساکت ہی ہوتا تا کہ اپنے موجودہ ہم جنس انسانوں کی تنگ دلی کا نظارہ نہ دیکھتا!) کہ اور ہم صفیرانِ چمن اس نغمے کو سنتے ہیں اور اس نئے ہم صفیر کا دلی مسرّت سے خیر مقدم کرتے ہیں مگر ہمارے باغِ سخن کے نو آموز عنادل کسی نو عمر عندلیب کا ایسا نغمہ جو اُن کے نغمے سے بدرجہا بہتر ہو بغیر رشک کے نہیں سن سکتے! تعجب ہے اور افسوس!''[۲۲]

۳۱

اُن دنوں عطا محمد برٹش بلوچستان میں ایس ڈی او تھے۔ انگریز میجر انجینئر سے جھگڑا کر بیٹھے۔ اُس نے کسی دیسی ملازم کو ساتھ ملا کر جو پہلے ہی اِن سے پرخاش رکھتا تھا، سازش کی اور ایک دن اہلِ خانہ کو اطلاع ملی کہ عطا محمد اسٹور سے مال خورد بُرد کرنے پر حراست میں لے لیے گئے ہیں۔[۲۳]

اقبال نے سُنا تو بے چین ہو گئے۔ فوراً دوستوں کی محفل اُٹھا دی اور سامان باندھا۔ عام حالات میں سفر کے تصور سے بھی اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے مگر یہ معاملہ عطا محمد کا تھا۔ ٹرین پر بیٹھ کر بلوچستان پہنچے۔ یہ راستے کا آسان ترین حصّہ تھا۔ قلعہ سنڈیمن پہنچنے کے لیے جہاں عطا محمد تھے، ابھی کوئی مزید سو میل کا سفر گھوڑے اور اونٹ پر طے کرنا تھا!

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِس سفر میں اقبال کو پوری طرح اندازہ ہُوا کہ امیر نے اُن کی زندگی میں کیا اہمیت حاصل کر لی ہے۔ دُور ہونے سے کشش کم نہیں ہوئی تھی بلکہ بڑھ گئی تھی۔

از مقام مغل کوٹ

ڈیر سیّد تقی۔ السّلام علیکم...خدا کی پناہ! پہلے روز ۳۷ میل کا سفر گھوڑے پر کیا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی لیکن جو تکلیف محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو وہ لذیذ ہو جاتی ہے...بھائی صاحب کے متعلق خبر ملی۔ ان کو رائل انجینئر کوئٹہ کے تار پر تار دینے کی وجہ سے حراست سے نکال دیا ہے...

امیر کہاں ہے، خُدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں۔ مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے۔ جِتنا دُور ہو رہا ہوں۔ اُتنا ہی اُس سے قریب ہو رہا ہُوں۔ والسّلام۔

شیخ صاحب [عبدالقادر] کی خدمت میں یہ تمام حالات عرض کر دیں۔ والسلام۔ آپکا

مخلص محمد اقبال

۲۷

دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیأ کا عُرس تھا۔ ہجوم میں ایک درویش قسم کا آدمی نظم پڑھ رہا تھا۔ بال کمر تک لمبے اور سینہ اِتنا تنگ جیسے بارہ برس کا بچہ ہو۔[۲۴] یہ درگاہ کے توشہ خانے کے مہتمم خواجہ حسن نظامی تھے جن کا سلسلۂ نسب خواجہ نظام الدین اولیأ سے ملتا تھا۔ مشہور انشأ پرداز تھے۔

نظم میں دہلی کے خواجہؒ سے درخواست کی گئی تھی کہ شاعر کی مشکلیں آسان کر دیں اور اُس کا بھائی جن مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اپنی برکت سے اُنہیں دُور کر دیں۔ اِس کے لیے شاعر نے دہلی کے خواجہ کو اُن کے ایک مرید کا واسطہ دیا تھا جو اُن کا ہم نام گزرا تھا:

محوِ اظہارِ تمنّائے دلِ ناکام ہُوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہُوں

یہ نظم اقبال نے حسن نظامی کو بھیجی تھی۔ ترکیب بند تھی۔ تین بند تھے جن میں اشعار کی تعداد بتدریج بڑھتی جاتی تھی یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ۔ عنوان 'برگِ گل' تھا۔[۲۵]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

نظم کے دوسرے بند میں خواجہ کو مدفونِ یثرب ؐ کی قسم دی تھی۔ ایک بزرگ کو اِتنی بڑی قسم دینا جسارت کی بات تھی جس کے لیے اقبال نے کسی نہ کسی سے اجازت لی ہو گی یا پھر خواجہ سے اُنہیں کوئی خاص تعلق پیدا ہو چکا ہوگا۔

۲۹ جولائی کو ہفت روزہ وطن لاہور میں 'مناجات' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

۳۲

مکتوب بنام نواب حبیب الرّحمٰن شروانی

از شہر سیالکوٹ

۶ اگست ۱۹۰۳ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ خان صاحب

السّلام علیکم

...خدا کے فضل سے اُس تشویش کا خاتمہ ہوا... بھائی صاحب بَری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صَرف ہوا تاہم شُکر ہے... ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عُود کر گئی... والسّلام

آپ کا مخلص

محمد اقبالؔ

۳۳

کوئٹہ سے واپسی کے بعد اقبال اور امیر بیگم کی پہلی ملاقات کا احوال معلوم نہیں مگر ایک غزل کے اِستعاروں کے پردے کے پیچھے سے کوئی نغمہ اُبھرتا سنائی دیتا ہے۔

غزل

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا
تمھیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا
دِکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا مِرا دُور رہنا
وہ سَو ناز اقبالؔ پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے اُن کو مشہور رہنا

اِس غزل کے تیرہ شعر دستیاب ہیں۔ ۲۶ اگست میں ''نادرکاکوری نے دُور سے دیکھا مجھے'' والی غزل خدنگِ نظر لکھنؤ میں اور یہ غزل مخزن میں شائع ہوئی۔ مخزن میں اس کے ساتھ اسی زمین میں نیرنگؔ اور اعجازؔ کی غزلیں بھی شائع ہوئیں:

یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا
ترے جور سہ کر بھی مسرور رہنا
نیرنگؔ

ہر ایک حال میں شاد و مسرور رہنا
نہ مغموم رہنا نہ رنجور رہنا
اعجازؔ

ص۵-اپر میرٹھ کے منشی نیاز احمد کا مضمون زندگی کی خزاں 'اقبال کی ایک غزل کے شعر سے شروع ہوا تھا:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

مضمون اسراف کے خلاف تھا۔ ''جیسے پرانی رسمیں اور ان کے بے جا اخراجات ناپسندیدہ ہیں ویسے ہی نئے فیشن کے بھی غیر ضروری مصارف گراں اور قابلِ انسداد خیال کیے جاتے ہیں اور یہ سراسر انصاف کا خون ہے کہ پرانی لغویات چھڑا کر نئی لغویات کا رواج منظور کیا جائے۔''

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ص ۸-۵ پر کسی جہانگیر کا مضمون 'ایک سین اور اس کے چھ پردے' کنارِ راوی کے بعض مناظر کی لفظی تصویر کشی پر مشتمل تھا۔ ص ۵۲ پر اسی مصنف نے اقبال کی غزل کا جواب دیا تھا:

مانا کہ ضبط عشق میں سیکھا کرے کوئی
بے اختیار دل کو مگر کیا کرے کوئی

اُس مہینے حسرت موہانی کے رسالے اُردوئے معلّیٰ میں ایک مضمون 'اُردو زبان پنجاب میں' شائع ہُوا۔ لکھنے والے کے نام کی جگہ 'تنقیدِ ہمدرد' چھپا۔ ممکن ہے خود حسرت موہانی نے لکھا ہو۔ مضمون نگار نے خوشی محمد ناظر اور اقبال کی زبان پر اعتراضات کیے تھے اور آخر میں کہا تھا کہ خلافِ محاورہ زبان کے رواج سے بہتر ہے کہ اُردو زبان کا پنجاب میں فروغ ہی نہ ہو۔[۲۷]

۳۴

۷ اگست ۱۹۰۳ء کو خواجہ صاحب والی نظم پنجۂ فولاد میں 'ایک دردمند دل کی عرض' کے طور پر شائع ہوئی۔

اقبال اور شیخ عبدالقادر کے درمیان کبھی کبھی یہ بحث ہوتی تھی کہ حسن نظامی جوان ہوں گے یا بوڑھے۔ اقبال کا خیال تھا کہ عمر رسیدہ آدمی ہوں گے۔[۲۸]

۳۵

ہر صبح قرآن پڑھتے ہوئے تاریخ اور قبل از تاریخ کے پراسرار واقعات اقبال کی آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ آدم کو بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک امانت کائنات کی ہر شے کے سامنے رکھّی مگر کسی نے اس بوجھ کو اُٹھانے کی ہمّت نہ کی۔ پھر اسے آدم نے قبول کیا۔ وہ بوجھ کیا تھا؟

شیخ نور محمد کبھی کبھی کہتے، "نجانے بندہ اپنے ربّ سے کب کا بچھڑا ہوا ہے" اور اُن کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔[۲۹]

۳۶

عرب صُوفی نسفی نے کہا تھا کہ حسنِ ازل جسے حقیقتِ اصلی کہنا چاہیے لامحدود ہے۔ فطرت ایک آئینہ ہے جس

(c) 2014. Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میں اُس کی جھلک نظر آتی ہے مگر آئینہ بھی دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جو محض حسن کا عکس پیش کرتا ہے اور بزمِ قدرت ایسا ہی آئینہ ہے۔ دوسری طرح کا آئینہ حسن کے باطنی جوہر کو بھی محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ انسان ہے جو اُس لامحدود ہستی کی ایک محدود صورت ہے مگر بھول کر خود کو اُس سے الگ سمجھ بیٹھتا ہے۔[۳۰]

ایک صبح شاعر نے سورج سے اپنی سیہ روزی کا سبب پوچھا تو بزمِ قدرت کی غیبی آواز نے اُسے یہی بات سمجھائی۔ یہ نظم ترکیب بند تھی۔ دو بند تھے۔ تئیس شعر۔ عنوان 'انسان اور بزمِ قدرت' تھا:

تُو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے[۳۱]

اُن دنوں عربی ادب کا مطالعہ زیادہ کر رہے ہوں گے کیونکہ اُنہی دنوں کی ایک اور نظم میں ریت گھڑی کی ریت سے پوچھا، ''فتنہ جُو نے تجھ سے دشتِ عرب چھڑایا؟'' پھر اُس کی صدیوں کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے بہت سے تاریخی واقعات کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے:

تُو گردِ پائے شائد بصرے کے زائروں کی
بانگِ درا سے تیرا ہر ذرّہ ہے شناسا

یہ بھی ترکیب بند تھی۔ بارہ اشعار کا ایک بند تھا۔ عنوان 'شیشۂ ساعت کی ریگ' تھا۔[۳۲]

ستمبر میں 'شیشۂ ساعت کی ریگ' خدنگِ نظر میں اور 'انسان اور بزمِ قدرت' مخزن میں شائع ہوئی۔ ص ۱۶ پر شاد عظیم آبادی کے قلم سے ایک شذرہ شائع ہوا تھا:

صوفیونکی شان

حضرت شاہ بوعلی قلندر رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ میں پانی پت کی فوجداری پر ایک امیر بحال ہو کر دہلی سے آیا۔ ایک دن اِس فوجدار کی سواری جا رہی تھی۔ رستہ میں کوئی فقیر سامنے آ گیا۔ خاص برداروں میں سے کسی نے ایک بلّم اُسکے سر پر مار دیا تاکہ رستہ سے ہٹ جائے۔ اُس فقیر کا سر پھٹ گیا۔ اور خون بہنے لگا۔ وہ فقیر روتا ہوا قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر فریادی ہوا۔ قلندر صاحب بیٹھے جھوم رہے تھے۔ آپ کو غصہ آ گیا۔ منشی کو بلا کر فرمایا بنویس

"مرزبان ہندوستان بداند کہ سگے از سگانِ دنیا فقیرے را بر سر زد بجائے او دیگرے را فرست ورنہ بجائے تو دیگرے را بفرستم۔" غرض یہ خط جب تغلق (شاہنشاہِ ہند) کے پاس پہنچا تو گھبرا گیا خط کا جواب لکھا گیا۔ اب یہ تجویز ہونے لگی کہ کون لیجائے۔ امیر خسرو تجویز کئے گئے اور بادشاہی خط لیکر پانی پت آئے جب قلندر صاحب کی خدمت میں پہونچے تو قلندر صاحب نے فرمایا کہ "خسروِ جانہ کو (غزل گو) توئی اگر از کلام سعدی چیزے یادداری بخواں۔" امیر خسرو نے شیخ سعدی کا یہ مطلع پڑھا۔

ایکہ گفتی ہیچ مشکل جز فراقِ یار نیست
گر اُمیدِ وصل باشد آنچناں دشوار نیست

سنتے ہی قلندر صاحب نے ایک نعرہ مارا اور تین دن ہوش نہ آیا۔ (شاد عظیم آبادی)

۳۷

'اُردو زبان پنجاب میں' نے اچھا خاصا معرکہ گرم کر دیا۔ میر غلام بھیک نیرنگ نے "انبالوی" کے نام سے اس کا جواب لکھا جو شاید ستمبر میں کہیں شائع ہُوا۔

اقبال نے اپنے دردِ عشق سے کہا نامحرموں میں آشکار نہ ہو، شاعر سے کہا خاموش رہے اور بانسری سے کہا کہ جدائیوں کی شکایت کو سینے میں دبا لے:

یہ دَور نکتہ چیں ہے کہیں چھُپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تُو مکیں ہے وہیں چھُپ کے بیٹھ رہ

اِس کے بعد خود اساتذہ کے کلام سے اسناد تلاش کرنے میں مصروف ہوئے اور اُن کی نظم 'دردِ عشق' ۲۸ ستمبر کے پنجۂ فولاد میں شائع ہوئی۔ ترکیب بند تھی۔ دو بند تھے۔ اکیس اشعار۔[۳۳]

۳۸

علی بخش کو اقبال کی پیشکش یاد تھی۔ اُس نے گاؤں سے اپنے بھائی کو بلوایا کر حاکم علی کے گھر نوکر رکھوا دیا اور خود

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اقبال کے پاس آ گیا۔ اقبال کے معمولات کو سمجھنے میں اُسے کچھ وقت لگا۔

ان کی طبیعت کچھ اس طرح کی تھی کہ گردوپیش کی دُنیا سے زیادہ اپنے ذہن میں رہتے تھے۔ کئی سرگرمیاں تھیں جنہیں سچ مچ انجام دینے کی بجائے فقط سوچ کر ہی ان کی تسکین ہو جاتی تھی چنانچہ ہلنا جُلنا ناگوار گزرتا تھا اور کوشش کرتے تھے کہ اس کے بغیر سارے کام کروالیں۔ کبھی اکھاڑے میں لنگوٹ کس کر ورزش بھی کی تھی مگر اب شاید وہ مشغلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ بس ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کرنا اور پھر تلاوت ایسا معمول تھا جسے وہ کبھی ترک نہیں کرتے تھے۔

کالج سے واپس آنے کے بعد گرمیوں میں دھوتی اور بنیان پہن لیتے تھے۔ سردیوں میں اُس پر کشمیری دُھسّے کا اضافہ ہو جاتا تھا اور بس! گھر میں زیادہ وقت آرام کُرسی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے گزرتا اور ایسے میں علی بخش کا کام یہ ہوتا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُن کا حقہ تازہ کرتا رہے۔ تمبا کو نظام دین کے کھیت سے آتا تھا۔

شام کو دوستوں کی آمد ہوتی اور وہ اُسی آرام کرسی میں پڑے پڑے اُن سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ ایسے میں علی بخش کو اُن کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی علمی گفتگو ہو رہی ہے اور ویسے علمی گفتگو کا مطلب وہ جانتا بھی نہیں تھا۔

کبھی اقبال کسی دوست کو بھیج کر امیر بیگم کو بلوا لیتے تو پھر ساز و نغمہ کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔

دِلبرِ جانانِ من، برد دل و جانِ من
برد دل و جانِ من، دلبرِ جانانِ من

(حافظؔ)

یہ علی بخش کی سمجھ سے اونچی باتیں تھیں۔ اُسے تو کھانا پکانا بھی نہیں آتا تھا۔ کہیں سے آلو گوشت کا سالن پکانا سیکھ لیا تھا۔ مسلسل کئی مہینے اقبال کو یہی کھلاتا رہا اور وہ بھی چپ چاپ زہر مار کرتے رہے کیونکہ جب تک آم دسترخوان پر موجود ہوں وہ کسی دوسری چیز کی کمی محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

رات کو سوتے ہوئے وہ بڑے بھیانک خراٹے لیتے جو کبھی کبھی اچانک رُک جاتے اور ایک طویل ہانک سُنائی دیتی، ''علی بخش! کاغذ پنسل لے آؤ۔'' یہ دوڑ کر دونوں چیزیں لے جاتا۔ اقبال روشنی کرتے جس میں علی بخش کو بس اِتنا نظر آتا کہ اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا ہے، کسی دوسرے کے وجود کا احساس نہیں رہا اور تیزی سے کچھ لکھے چلے جا رہے

ہیں۔ علی بخش جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا ایک عرصے تک نہ سمجھ سکا کہ صاحب کو آدھی رات کے وقت یہ کیسا دورہ پڑتا ہے اور وہ اِس کا علاج کیوں نہیں کروا لیتے۔[۳۴]

کہوں کیا آرزوئے بے دِلی مجھ کو کہاں تک ہے؟
مِرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
زمانے بھر میں رُسوا ہُوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہُوں کہ میرا عِشق میرے رازداں تک ہے

اِس غزل کے سترہ اشعار دستیاب ہیں۔ اکتوبر میں مخزن میں شائع ہوئی۔[۳۵]

۳۹

ایمرسن ایک انگریز تھا جسے کسی ہندوستانی پر گولی چلانے کی پاداش میں انگلستان واپس بھجوایا گیا تھا مگر یہاں انصاف کے مطالبے نے زور پکڑا تو اُسے واپس بلوا کر مقدمہ قائم کیا گیا۔

۱۹ اکتوبر کو مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ عدالت نے فیصلہ سناتے ہوئے ایمرسن کو باعزت بری کیا تھا اور ملازمت کی بحالی اور مالی نقصان کی تلافی کا حکم بھی صادر فرمایا تھا۔

۴۰

شیخ عبدالقادر 'اردو زبان پنجاب میں' والی بحث کو ناگوار قرار دیتے تھے مگر اقبال نے جوابی مضمون لکھ لیا تو اُنہوں نے مخزن کے اکتوبر کے پرچے میں اِس نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا، ''جس تحقیق سے شیخ محمد اقبال صاحب نے کام لیا ہے، وہ قابلِ داد ہے اور اسے اس بحث کا خاتمہ سمجھنا چاہیے۔''

اقبال نے تنقیدِ ہمدرد کے آٹھ اعتراضات کے خلاف اپنے دفاع میں اساتذہ کے کلام سے استناد کیا تھا البتہ ''مجھ کو'' کی بجائے ''میں نے'' کے استعمال کو اپنی بے دھیانی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اعتراض تسلیم کیا تھا۔

اِس مضمون میں فارسی اور اُردو کے ۱۲۳ اساتذہ کے کلام سے دلائل تلاش کیے گئے تھے اور ساتھ میں حسرتؔ موہانی کے ایک شعر کا بھی حوالے دے دیا تھا۔ اساتذہ کے نام یہ تھے: امیرؔ مینائی، مومنؔ، مصحفیؔ، سوداؔ، میر تقی میرؔ، داغؔ، بہادر

شاہ ظفرؔ، عبدالوہاب، نساطؔ شیرازی، ناسخؔ، فردوسی، سعدی، فوقی ریزدی، نظامی، غالبؔ، امیر اللہ تسلیم، برقؔ، انیسؔ شیخ علی حزیںؔ، آتشؔ جلالؔ لکھنوی، ممنونؔ دہلوی، ملولؔ لکھنوی اور بیدلؔ۔

مضمون کے آخر میں اقبال نے لکھا تھا، ''اگر اہلِ پنجاب مجھ کو یا حضرت ناظرؔ کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو اُن کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ قسم بخدائے لایزال مَیں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اِس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔''

۴۱

Love and death
What time the mighty moon was gathering light
Love paced the thimey plots of paradise...

یہ ٹینی سن کی کمزور نظموں میں سے تھی مگر فنا اور بقا کے اَسرار کی جستجو میں نمودِ جہاں کی گھڑی تک پہنچنے کا بہانہ بنی۔ ترکیب بند کی صورت میں اقبال نے اِس حکایت کو نظم کیا جس کے مطابق روزِ ازل عشق کی مسکراہٹ نے موت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ دو بند تھے، اُنتیس شعر اور عنوان 'عشق اور موت' تھا۔[۳۶]

۴۲

پنجاب کا علاقہ بہاولپور اُن دنوں ریاست تھا جہاں کے نواب انگریزوں کی سرپرستی میں حکومت کیا کرتے تھے۔ ۱۲ نومبر کو اس علاقے کی درجن دیکھنے والی تھی نوابزادہ مبارک بالغ ہو گیا تھا اور وائسرائے ہند لارڈ کرزن اپنے ہاتھوں سے اُسے تاج پہنانے تشریف لا رہے تھے۔ دُور دُور کے مشاہیر کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے توسط سے ایک دعوت نامہ اقبال کو بھی ملا تھا۔[۳۷]

۱۲ نومبر کو شیخ عبدالقادر جشن میں شریک ہوئے کیونکہ صحافی کی حیثیت میں اُنہیں تو وہاں موجود ہونا ہی تھا البتہ ان کے ذمّے یہ پیغام بھی تھا کہ اقبال اپنی مصروفیات کی وجہ سے شریک نہ ہونے پر معذرت چاہتے ہیں اور ایک

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

قصیدہ مکمل کر رہے ہیں جسے بہت جلد مخزن میں شائع کر کے نواب صاحب کے حضور پیش کیا جائے گا۔

لاہور واپس پہنچ کر شیخ عبدالقادر نے اقبال کو بتایا کہ حسن نظامی بھی آئے تھے اور وہ بالکل جوان آدمی ہیں۔ اُن کے ہم عمر ہوں گے۔ اقبال کا اندازہ غلط تھا۔[۳۸]

۴۳

قصیدہ شان و شکوہ کے امکانات دریافت کرنے کا بہانہ تھا۔ غالب نے زمین پر فخر کرتے ہوئے فرشتوں سے کہا تھا، ''اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی!'' اقبال نے زمین کو چشمِ سکندر سے دیکھا اور ثریّا سے بھی بلند پایا۔ یہ اِس کے لیے ایک ایسے نواب کا قصیدہ بہانہ بنا جو عباسی حکمرانوں کی اولاد میں سے تھا۔ پہلی بار چراغِ لالہ کی اصطلاح استعمال کی جو بعد میں بہت کام آنے والی تھی۔

قصیدے کے دو بند تھے جن میں 'برگِ گل' کی طرح اشعار کی تعداد تبدریج بڑھتی تھی یعنی چوبیس اور پچیس، جن میں سے دوسرے بند میں بادشاہ کو عدل و انصاف کی اہمیت یاد دلاتے ہوئے شہنشاہ اکبر کی یاد دلائی تھی جسے دنیا اچھے نام سے یاد کرتی تھی کیونکہ اُس نے مسجد اور بتخانے کو قریب لا کر ناقوس اور اذان کو ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اِس قصیدے کا اختتام 'خیر مقدم' سے بھی زیادہ کھل کر اپنی خودداری اور قابلیت یاد دلانے پر ہوا:

پاک ہے گردِ غرض سے آئینہ اشعار کا
جو فلک رفعت میں ہو لایا ہُوں وہ چن کر زمیں
تھی تو پتھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے
ہوگئی ہے گل کی پتّی سے بھی نازک تر زمیں

یہ خالی خولی دعویٰ نہ تھا بلکہ واقعی قصیدہ ایک مشکل زمین میں کہا گیا تھا۔ نومبر کا مخزن دیر سے آیا مگر 'عشق اور موت' کے ساتھ 'قصیدۂ تہنیت نواب بہاول پور' بھی شامل تھا۔[۳۹]

اُنہی دنوں یہ ہفت روزہ وطن میں بھی شائع ہوا۔[۴۰]

نومبر ہی کے مخزن میں ص ۲۸-۱۷ پر ایک مضمون ''مقیاس الرّوح کا تعلق تصوّف کے ساتھ'' کے عنوان سے ایک قلمی نام سے شائع ہوا جس کے بارے میں یہ شبہ گزرتا ہے کہ ممکن ہے اقبال نے لکھا ہو۔ اس سے پہلے ادارتی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

نوٹ میں درج تھا، ''حال میں ایک صاحب نے جو جدّت طرازی کے شیدا ہیں۔ ایک مضمون 'مقیاس الروح' کے عنوان سے اخبار وطن لاہور میں شائع کیا تھا اور اس کے نیچے اپنا نام یوں لکھا تھا 'ایک ہستی غیر ذی روح'۔ خلاصہ اس مضمون کا تو یہ تھا کہ اقوامِ فرنگ اہلِ ایشیا کو اپنی مثل انسان نہیں سمجھتیں۔ اور جا بجا نوآبادیوں میں اور اپنے علاقۂ حکومت میں اُن سے ایسا سلوک کرتی ہیں۔ کہ گویا اُنمیں ''رُوح'' ہی نہیں۔ یہ بات اس دلچسپ پیرایہ میں بیان کی گئی تھی کہ رنگ یورپ کی جدید تحقیقات کے رُو سے ''مقیاس الروح'' ہے۔ اگر رنگ گورا ہے۔ تو ہستی ''ذی روح'' ہے۔ اور اس کے حقوق کا خیال ضروری ہے۔ اگر رنگ کالا ہے یا سانولا ہے تو غیر ذی روح ہے۔ یہ مضمون بھی اُسی زبردست قلم سے نکلا ہے۔ اس میں ایک تازہ مقدمہ پر جس میں ایک صاحب ایمرسن نامی ملزم تھے اور بری ہو گئے۔ بالکل نئی طرز میں رائے زنی کی گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ مضمون بنفسہٖ کسی پولیٹکل اخبار کے اوراق کے لیے زیادہ موزوں ہے اور ایک علمی اور ادبی رسالہ سے بہت مناسبت نہیں رکھتا۔ مگر اس کی طرزِ تحریر اور اس کی دلآویز عبارت اِسے حصۂ ادب میں شامل کرتے ہیں۔ اور اسی نظر سے ہم اسے یہاں درج کرتے ہیں۔ اور ایسا کرنے کی ہمارے ہاں پہلے بھی نظیر ہے:۔''

اس مضمون میں ایمرسن کے پورے قضیے کی تطبیق ایک حکایت سے کی گئی تھی جس میں کوئی شخص دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے اور پیچھے اُس کی بیوی بے گھر ہو کر دس سال غربت کا مقابلہ کرتی ہے اور ایک بدچلن عورت کے مشوروں کے باوجود راستے سے نہیں بھٹکتی۔ آخر فاقوں پر مجبور ہوتی ہے۔ ''ایسے عالم میں شیطان محلّہ کی اسی بدچلن عورت کی صورت میں ظاہر ہو کر اس کو ترغیب دیتا ہے کہ گناہ کر کے اپنی جان کو اس فاقہ کشی کی عذاب دہ موت سے بچائے اور وہ نصیبوں جلی مجبوراً اس پر راضی ہو جاتی ہے۔

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
جس سے عزّت کو ہے خوف اور جس سے عصمت کو ہے ڈر''

عورت کا شوہر واپس آ کر اُسے تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ آخر ایک بزرگ کے آستانے پر حاضر ہوتا ہے تو وہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ پہلے کسی چکلے سے ہو کر آئے۔ وہ شخص پہلے بدکتا ہے مگر پھر بزرگ کی ہدایت پر عمل کرتا ہے تو اتفاق سے اُسے وہاں جو عورت ملتی ہے وہ منت سماجت کرنے لگتی ہے کہ غربت سے مجبور ہو کر پہلے دفعہ یہاں آئی ہے اور اب پچھتا رہی ہے۔ وہ شخص گھونگھٹ اُلٹ کر دیکھتا ہے تو اپنی بیوی ہے۔ یوں میاں بیوی اکٹھے ہو جاتے ہیں

اور بزرگ کی ہدایت کی مصلحت واضح ہوتی ہے۔

مصنف جس نے اپنا نام ظاہر کرنے کی بجائے ''ہستی غیر ذی روح'' کا قلمی نام اختیار کیا تھا طنزاً لکھا تھا کہ ایمرسن کے معاملے میں بھی ایسی ہی مصلحت معلوم ہوتی ہے۔ اُسے انگلستان سے واپس بلوا کر مقدمہ چلانا انصاف کی خاطر نہ تھا بلکہ اُسے اُس کی دلی مراد دلوانے کے لیے تھا۔

''ہستی غیر ذی روح'' ایسا قلمی نام ہے جسے اقبال سے منسوب کرنے میں تامل ہو سکتا ہے ورنہ مضمون میں کئی باتیں ہیں جو اسے اقبال کی تحریر سمجھنے پر مائل کرتی ہیں۔ تینتیس برس بعد 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ شعر کہلوایا:

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

اُس نظم میں ابلیس نے کہا کہ صرف امامانِ سیاست ہی نہیں بلکہ کلیسا کے شیوخ بھی اُس کے زیرِ اثر ہیں۔ مضمون میں بھی انصاف کے ہندوستانی مطالبے کے حوالے سے درج تھا، ''ایک بڑے جغادری لاٹ پادری کی روح نے جس کو روحوں کی اصطباغ و تطہیر اور ہدایت و تلقین کے مشاغل کی وجہ سے عدم میں بھی چین سے لیٹنے کی فرصت نہ تھی۔ مدراس گورنمنٹ کے گوشِ نصیحت نیوش تک یہ پیغام پہونچا دیا کہ جو کالی ہستی شور و غوغا مچا رہی ہے اُس کو دم دلاسہ دینے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن طرزِ عمل وہی ملحوظ رہے جو شیکسپیر کی چڑیلوں نے میکبتھ کے متعلق اختیار کیا تھا۔''

اِسی شمارے کے ص ۴۶-۴۴ پر نادر علی خاں نادر (کاکوروی) نے اپنی نظم 'ریفارمیشن' اقبال کے نام معنون کی تھی اور اختتامیہ بند میں لکھا تھا:

منتظر ہوں میں امامِ آخرالایام کا
خیر مقدم از سرِ نو دعوتِ اسلام کا
حسرتِ وا دیدِ اعجازِ مسیحا ہے مجھے
انتظارِ آمدِ مہدی و عیسیٰ ہے مجھے
اے نویدِ وصلِ انصار و نصاریٰ السّلام

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

السّلام اے صبحِ شامِ خیرِ بطحیٰ السّلام

۴۴

ابھی تک اقبال کی شاعری میں جس فعل کا سب سے زیادہ ذکر ہوا وہ ''دیکھنا'' تھا۔ اب وہ ''دکھانے'' کا ذکر کرنے لگے۔ اُن کی نظم 'شاعر' کا صحیح زمانہ معلوم نہیں مگر انداز اِسی دَور کی ہے۔ اِس کے مطابق شاعر 'دیدۂ بینائے قوم' ہوتا ہے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

قومی شناخت سے اپنے آپ کو پہچاننا اور ''قومی بھلائی'' کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا اُس تہذیب کا حصہ بن چکا تھا۔ اس زمانے تک اقبال کی ملّی شناخت بھی پُختہ ہو چکی تھی۔ عیسائی مبلّغوں کا تدارک کرنے کی تجویز ہو یا کشمیری مسلمانوں کی تنظیم کی کوشش اُن کا قلم اور اُن کی آواز ضرور شامل ہوتی تھی۔

۴۵

ہم نے اقبال کو بہت ڈھونڈا
کوئی اِس نام کا نہیں ملتا[۴۱]

بھاٹی دروازے کا اقبال اِس لحاظ سے ایک معمہ ہے کہ اجتماعی سطح پر جس قوم اور جس معاشرے کی بقا چاہتا ہے انفرادی سطح پر اُس کی اخلاقیات کا مذاق اُڑانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس الجھن کو پہلے پہل جس شخص نے محسوس کیا وہ پڑوس میں رہنے والے ایک مولوی صاحب تھے جنہیں تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔[۴۲] کسی شناسا سے اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ متضاد خصوصیات کے حامل ہیں اور کہیں کسی نئے اسلام کی بنیاد نہ ڈال بیٹھیں۔ مولوی صاحب کی بات اقبال تک پہنچی تو اُنہوں نے خوب لُطف لیا اور ایک روز سرِ راہ ملے تو یہ ذکر چھیڑ دیا۔ ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ معلوم نہیں مگر پورے واقعے کو نظم کرتے ہوئے اقبال نے اُس گفتگو کا جو خلاصہ دیا وہ بڑی حد تک اصل سے قریب رہا ہوگا:

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مِرا راہ شریعت کی دکھانی
مَیں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قُربِ مکانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اُس کی جُدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے[۴۳]

تمیں اشعار کی ترکیب بند تھی اور عنوان 'زُہد اور رِندی' تھا۔ اُنہی دنوں امریکی شاعر لانگ فیلو کی نظم 'Daybreak' نے فنا اور بقا کے مسئلے کو دوبارہ نظم میں لانے کا موقعہ دیا۔ وہ بھی ترکیب بند ہوئی جس میں بارہ شعر تھے اور عنوان 'پیامِ صبح' تھا۔[۴۴]

دسمبر میں 'پیامِ صبح'، فتنہ و عطر فتنہ میں اور 'زُہد اور رِندی'، مخزن میں شائع ہوئیں۔ نیرنگ اور اعجاز ستمبر کی چھٹیوں میں شملہ گئے تھے۔ نیرنگ کی تاثراتی نظم 'کوہستان کا نظارہ' اور اعجاز کی نظم 'ابرِ کہسار' ص ۴۳-۴۶ پر شائع ہوئیں۔ اعجاز کی نظم کا پہلا شعر تھا:

لو گھٹا چھا گئی پہاڑوں پر
لو بہار آ گئی بہاروں پر

۴۶

"عقل کی انتہا کیا ہے؟"
"حیرت"، اقبال نے جواب دیا۔
"اور عشق کی انتہا کیا ہے؟"
"عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ عشق لاانتہا ہے!"

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

''پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے: ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں!''

''دُوسرا مصرع بھی تو پڑھیے...''[۴۵]

غزل

ترے عِشق کی انتہا چاہتا ہُوں
مِری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہُوں

سِتم ہو، کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہُوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہُوں

چلو، مِل کے اقبالؔ کے گھر کو ڈُھونڈیں
کہ مَیں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہُوں

اِس غزل کے پندرہ اشعار دستیاب ہیں۔[۴۶]

۴۷

کوئی عبدالغفور خاں تھے جن کی فرمایش پر اقبال نے کسی ڈانک کا ترجمہ تین اشعار میں کیا:

نیکی ہو ہر اِک فعل میں نیت کی ہویدا
ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا

۴۸

سر سیّد کہہ گئے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات دن بدن نمایاں ہوتے جائیں گے اور جو زندہ رہے گا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اقبال زندہ تھے اور دیکھ رہے تھے۔ اختلافات نقطۂ عروج پر دسمبر ۱۹۰۳ء میں انگریز

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

حکمرانوں کے اِس اعلان کے ساتھ پہنچے کہ ہندو اکثریت کا صوبہ بنگال تقسیم کیا جائے گا۔

بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ اِس صوبے کے دو حصے ہوتے جن میں مغربی بنگال میں بدستور ہندوؤں کی اکثریت رہتی اور برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ بھی اِسی صوبے میں رہتا مگر ایک مشرقی بنگال بھی وجود میں آ جاتا جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور اُس کا صدر مقام ڈھاکہ ہوتا۔

احتجاج شروع ہوا۔ کانگریس اور انتہا پسند اکٹھے ہو گئے۔ مشرقی بنگال میں بھی جلسے کروائے گئے اور تقسیم کے خلاف پمفلٹوں کی ہزاروں کاپیاں بانٹی گئیں۔ مسلمان بے چین ہوئے اور سوچنے پر مجبور ہوئے، ”کیا ہندوستان ہمارا وطن نہیں ہے؟“

دُوسرا حصہ

۴۹

جنوری ۱۹۰۴ء کے مخزن میں ”ترے عشق کی انتہا چاہتا ہُوں“ والی غزل اور ’ترجمۂ ڈائک‘ شائع ہوا۔[۴۷]

۵۰

غالباً سردیوں کی چھٹیوں میں اقبال سیالکوٹ آئے تھے۔ عطا محمد کے یہاں ایک اور لڑکا پیدا ہو چکا تھا جس کا نام امتیاز رکھا گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اقبال نے چھینا، وہ چلّایا اور اِنہوں نے ایک نظم لکھی جس میں بچے سے کہا تھا کہ وہ اِن کی مہربانی کو نامہربانی سمجھ رہا ہے مگر ایسی بھول اِن سے بھی ہوتی رہتی ہے:

میری آنکھوں کو لُبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری

ترکیب بند تھی۔ کل بیس اشعار تھے۔ عنوان ’طفلِ شیر خوار‘ تھا۔[۴۸]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۵۱

فروری میں اُردوئے معلی میں اقبال کے مضمون کے جواب میں تنقیدِ ہمدرد کا 'اِصلاحِ زبانِ پنجاب' چھپا۔ دلائل تسلیم نہیں کیے گئے تھے۔[۴۹]

اس مہینے مخزن میں طفلِ شیرخوار شائع ہوئی اور ص ۵۵-۵۴ پر کسی شاعر رَضاؔ کی ایک غزل جو اقبال کی ''عرقِ انفعال کے'' والی غزل کی زمین میں تھی:

اقبالؔ بیمثال عجب چیز ہے رَضاؔ
دھودھو کے پاؤں پیے جیو اس باکمال کے

۵۲

مغربی ادب سے اُنیسویں صدی کے شروع کی رومانویت اور اواخر کا انحطاط لے کر اُس بنگالی ادب کا خمیر تیار ہوا جس میں ہندوستان کو انگلستان اور فرانس کی طرز پر ایک ریاست سمجھا گیا تھا۔

مغربی تہذیب میں امریکہ ایک ایسا عنصر تھا جو روایات کے پھندوں سے آزاد تھا اور اسے اقبال نے اُس وقت دریافت کیا تھا جب بنگال کے کولمبس بحرِ ظلمات کے پار نہیں پہنچے تھے۔ ایمرسن کی نظم سے ماخوذ 'ایک پہاڑ اور گلہری' غالباً اقبال پہلے ہی لکھ چکے تھے مگر اب امریکی صوفی کی ایک اور نظم نے اُن کی توجہ کھینچی۔ 'گڈبائے' میں ایمرسن نے دنیا کو خداحافظ کہہ کر عدم کی طرف سفر کرنے کی بجائے فطرت کی طرف رجوع کیا تھا اور اُس کے لیے فطرت غفلت اور فرار کی بجائے آگہی کا ذریعہ بن گئی تھی۔

'رُخصت اے بزمِ جہاں' ستائس اشعار کی نظم تھی۔ اِس کی ہئیت مثنوی کی تھی۔ پہلے بند میں بارہ، دوسرے میں چھ اور تیسرے میں نو شعر تھے:

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اُس کی نمود
گُل کی پتّی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بُود

یہ بنگالی ادب اور اُس سے پیدا ہونے والے تصورات پر بڑی لطیف تنقید تھی۔ فروری میں دکن ریویو میں شائع ہوئی۔ شیخ عبدالقادر نے مخزن کے لیے کوئی نظم طلب کی تو اقبال نے کچھ ترمیم کے ساتھ یہی نظم دے دی جسے اِس

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ادارتی نوٹ کے ساتھ مخزن کے ص ۴۴-۴۲ کے لیے کتابت کروالیا گیا: "شیخ محمد اقبال صاحب انجمن حمایت اسلام لاہور کے عظیم الشان جلسے کے لیے نظم لکھنے میں بیحد مصروف تھے۔ جب اس رسالہ کی ترتیب کا وقت آ پہنچا۔ اس لئے کوئی چیز خاص اس مخزن کے لئے نہیں لکھی جا سکی۔ انہیں دنوں میں انکی ایک دلپذیر نظم دکن ریویو میں چھپی ہے۔ اس کو بعض ضروری ترمیموں کے ساتھ وہ ہمیں بغرضِ اشاعت عنایت کرتے ہیں۔ اکثر حضرات کے لئے بھی یہ نئی چیز ہوگی:-"۵۰

۵۳

عرصۂ تقریر تنگ ہونا موجبِ پریشانی نہ رہا بلکہ خاموشی گفتگو بن گئی۔ شراب مینا بن گئی۔ چمن والے مل کر اقبال کی طرزِ فغاں لُوٹ رہے تھے تو اُن کی داستاں کو ہر طرف بکھرنا ہی تھا۔ بنگال کے ہندو ادب اور مولوی صاحب کی نیکی ماضی کی طرف دیکھتی تھیں مگر صوفیوں نے ہمیشہ مستقبل سے آگاہی کا دعویٰ کیا تھا۔ یوسفِ یثربؐ کے جمال کو اپنے دل کے آئینے میں دیکھنے والے کو حضرت عیسیٰ کی واپسی کا انکار کرنا زیبا نہ دیتا تھا جبکہ وہ قید خانے میں اپنے ساتھیوں کے خواب کی تعبیر دے سکتا ہو۔ عشقِ رسولؐ جس علم کا سرچشمہ تھا وہ صرف ماضی اور حال تک محدود نہ تھا:

سنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے
مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

نظم کا عنوان 'تصویرِ درد' تھا۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کے لیے لکھی۔ ترکیب بند تھی۔ ۱۲۸ شعر تھے۔ دس بند تھے جن کی طوالت یکساں نہ تھی۔ اِس نظم کے لیے یہی مناسب تھا۔

تصویرِ درد

(بند۴)

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہُوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اِک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا

مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رُلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دِیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
ہوائے امتیازِ ملّت و آئیں کی موجوں نے
غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گل چیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے
مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردُوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل! صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اُس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہُن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذّتِ تقریر پیدا کر
زمیں پر تُو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
تغیّر اِس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

کہ ہے چُپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں
مزہ دیتا نہیں کچھ صورتِ گل صدزباں ہونا
زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اِتنی زبانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
ہوا پیکار کی آخر اُجاڑے گی گلستاں کو
خدا رکھّے یہ ہے اپنے پرانے مہربانوں میں
قیامت ہے کہ ہر ذرّے سے پیدا سو مصیبت ہے
زمیں بھی اپنی شائد جا ملی ہے آسمانوں میں
اُڑا لے جائے گی موجِ ہوائے نیستی ان کو
نہ ہو جب راہ پیائی کی طاقت ناتوانوں میں
رُلایا خوں مری آنکھوں کو تیرے خوابِ غفلت نے
مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلکِ قدرت نے[۵۱]

۵۴

پروفیسر آرنلڈ انگلستان واپس جارہے تھے۔ فروری میں گورنمنٹ کالج میں الوداعی جلسہ ہوا۔ کئی طلبہ نے اپنی نظمیں پڑھیں۔ "یہ نظم اُس وقت لکھی بھی جا چکی تھی،" اقبال نے بعد میں اپنی الوداعی نظم کے بارے میں کہا۔ "تاہم اِس خیال سے کہ اِس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک دردانگیز اظہار تھا کسی عام جلسے میں اِس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔"[۵۲]

جاتے جاتے آرنلڈ دو اچھی باتیں اُن کے کان میں ڈال گئے۔ پہلی یہ کہ اُن کے لیے گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں مستقل ملازمت کی بات ہوگئی ہے۔[۵۳] دوسری یہ کہ اقبال انگلستان چلے آئیں اور وہاں تعلیم حاصل کریں۔ ۲۶ فروری کو وہ رخصت ہوگئے۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۵۵

کچھ عرصے سے نظموں میں اُداسی در آئی تھی۔ اُن دنوں کی نظموں کا مزاج پچھلے برس سے بہت مختلف تھا جب ایک سرشاری کی کیفیت میں نظمیں لکھی تھیں۔ اُداسی کی وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر یہ معلوم ہے کہ ایک مرحلے پر امیر بیگم کی والدہ نے اُن کی اقبال سے ملاقات پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ۱۹۰۴ء کا سال پچھلے برس سے مختلف ثابت ہوا۔

''اُستاذی قبلہ آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد اُن کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ کئی دن تک سکوتِ قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا،'' اقبال کا بیان ہے۔[۵۴]

۵۶

مارچ کی آخری تاریخ سے پہلے ہی اقبال کو گورنمنٹ کالج میں تقرری کا پروانہ مل گیا اور اُنہوں نے اورینٹل کالج میں استعفیٰ دے دیا۔[۵۵]

۵۷

انجمن حمایتِ اسلام کا اجلاس تین روزہ تھا۔ یکم اپریل کو پہلا دن تھا۔[۵۶]

اِس دفعہ لوگ پہلے سے زیادہ تعداد میں آئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا الطاف حسین حالؔی بھی تشریف لائے تھے۔ اُن سے پہلے اقبال کو اپنی نظم سُنانی تھی اور اُن سے پہلے مولوی احمد دین عُرف الف دین کو تقریر کرنی تھی۔ تقریر طویل ہوگئی تو مجمع میں بے چینی پھیلی اور آوازیں آنا شروع ہوئیں، ''الف دین' بے دین ہوگیا!'' کوئی اور وقت ہوتا تو اقبال اس فقرے سے محظوظ ہوتے مگر اِس موقع پر اُنہیں غُصّہ آیا۔ شاعر سے کالج کے اُستاد بن گئے اور مجمع کو ڈانٹا،

''اگر آپ لوگ خاموشی سے تقریر نہیں سنیں گے تو میں نظم بھی نہیں سُناوں گا۔''

خدا خدا کر کے اُن کی باری آئی۔ اُنہوں نے شلوار قمیص اور چاندنی جوتے پہنے ہوئے تھے۔ گریبان کا بٹن کھلا تھا۔ چہرے پر ناک پکڑ عینک لگی تھی۔[۵۷] اُنہوں نے ترنّم سے 'تصویرِ درد' پڑھنا شروع کی اور اُس کی کاپیاں دھڑا دھڑا بکنے لگیں۔ ایک شعر حالؔی نے بھی دس روپے میں خریدا۔ خواجہ حسن نظامی کو شائد حال آ گیا۔ اپنا عمامہ اقبال کے سر پر رکھ دیا جسے عبدالقادر نے بہت کہہ سن کر واپس کیا۔[۵۸]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اقبال کے بعد حالؔی کھڑے ہُوئے۔ وہ آواز جس نے پہلی بار مسدس سنائی تھی اب نحیف تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا نظم گھر بھول آئے ہیں۔ ارشد گورگانی نے آگے بڑھ کر اعلان کیا:

سنتے ہیں کہ اس بزم میں حالؔی آئے
سننے کو ہیں حالی و موالی آئے
کیا شوق ہے کیا خوف ہے کیا گھبراہٹ
بھول آئے ہیں نظم، گھر سے خالی آئے

معلوم ہوتا ہے اِسی جلسے میں عبدالقادر نے اقبال سے کہا کہ وہ کوئی ایسی نظم کیوں نہیں لکھ دیتے جسے ہندوستان میں قومی نغمے کے طور پر گایا جا سکے۔[۵۹]

اگلے روز مولانا حالی نظم ساتھ لائے، 'مادرِ پنجاب انجمن'، مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ پیچھے بیٹھے ہوؤں نے کہا، "آواز نہیں آ رہی۔ اقبال سے پڑھوائیے۔" ایک بار نظم سُنا چکے تو اقبال کو حکم ہوا کہ اپنی گونج دار آواز میں اُسے دُہرائیں۔[۶۰] اُنہوں نے نظم سنانے سے پہلے فی البدیہہ رباعی پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالؔی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالؔی
میں کشورِ شعر کا نبی ہُوں گویا
نازل ہے مِرے لب پہ کلامِ حالؔی[۶۱]

مخزن کا مارچ کا شمارہ کسی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے آخر میں اضافی صفحات لگا کر 'تصویرِ درد' اس ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کی گئی: "یہ وہ دلپذیر نظم ہے جو انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ جلسہ میں شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے نے پڑھی جسکی طرف اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ رسالہ پورا تیار ہو چکا ہے۔ ہم زائد صفحے اِسکی خاطر لگا دیتے ہیں۔ تا کہ ناظرین جلد اس سے محظوظ ہو سکیں اور انکو ماہ آیندہ تک انتظار نہ کرنا پڑے۔"

تیسرا حصہ

۵۸

اپریل میں علم الاقتصاد کا ایک حصہ مخزن میں اس ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا: ''شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے حال میں ایک کتاب پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایما سے علم الاقتصاد پر لکھی ہے۔ جس کا انگریزی نام ''پولیٹکل اکانمی'' ہے اور جسے عموماً ''علم سیاستِ مدن'' کہتے ہیں۔ بلا مبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ ہندوستان میں اس علم کا ابھی بہت کم چرچا ہے۔ حالانکہ اسے بغور پڑھنے کی ہندوستان کو نہائت ہی ضرورت ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو ہمیں کامل امید ہے کہ شیخصاحب کی شہرت اور اُس کی ذاتی خوبی مقبولیت کو اس کے استقبال کے لئے اُڑا کر لائیگی۔ اور علاوہ عام قدردانی کے خاص جماعتیں اِسے خریدینگی۔ ٹکسٹ بک کمیٹی نے اسے پسند کیا ہے اور ایک سو جلدیں خریدنا منظور فرمایا ہے۔ ہم قابل مصنف کی اجازت سے اسکا ایک دلچسپ حصہ نقل کرتے ہیں۔ کتاب زیرِ طبع ہے:۔''

منتخب حصے کا عنوان تھا 'آبادی'۔[۶۲] اقبال نے لکھا تھا: ''افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے... جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو، وہاں کے لوگوں کو چاہیئے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو استعمال کریں، جو آبادی کی ترقی کو روکتے ہیں۔''

اقبال نے یہ کتاب مسٹر اسکوٹر کے نام منسوب کی تھی جو محکمہ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر تھے۔ پوری کتاب اسی سال شائع ہوئی مگر اس کی درست تاریخ معلوم نہیں۔[۶۳]

''ذرا خیال کرو کہ غریبی... سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے... اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ... کیا یہ ممکن نہیں ہے ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟''

(c) 2014; Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۵۹

مثنوی کی ہیئت میں سترہ شعر کی نظم ہوئی جس کے اقبال نے دو بند بنائے۔ پہلے میں سات اور دوسرے میں دس شعر تھے۔ سورج کی کشتی کا ایک ٹکڑا دریائے نیل کی سطح پر تیرتا پھرتا تھا، پھر چاند نکلتا تھا اور اقبال اُسے مخاطب کر کے بہت سی باتیں کرتے تھے جن میں یہ بھی شامل تھی:

قافلہ تیرا رواں بے منّتِ بانگِ درا
گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آوازِ پا

نظم کا عنوان 'ماہِ نَو' تھا۔[۶۴]

۶۰

شیخ عبدالقادر نے اقبال کو بتایا کہ وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے انگلستان جا رہے ہیں۔

اقبال کے دل میں آرنلڈ کے جانے کی اُداسی بڑھ گئی ہوگی۔ ''ایک روز تخیل نے اُن کے مکان کے سامنے لا کے کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان آ گئے،'' اُن کا بیان ہے۔ الوداعی نظم میں بہت سی تبدیلی ہوگئی۔ آٹھ بند کی مسدّس ہوئی جسے مخزن میں اشاعت کے لیے دے دیا:

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلّی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو
''تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جو کو ہے سخن تصویر کا''[۶۵]

تصویر کے دہن والا شعر امیؔر مینائی کا تھا۔ اقبال نے عبدالقادر سے کہا کہ وہ بھی بڑے بھائی کو خط لکھ کر اخراجات کا بندوبست کروانے کے لیے کہیں گے۔[۶۶]

مئی میں عبدالقادر روانہ ہوگئے۔ اُس ماہ مخزن میں 'نالۂ فراق' اقبال کے تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ص۵۸-۵۶ پر بدرالدین قیصری (لاہور) کی نظم 'اقبال' شائع ہوئی جس کے بارے میں شاعر نے لکھا تھا، "یہ نظم میں نے اپنے ارادے سے نہیں لکھی بلکہ اقبال کی زبردست سخنوری نے جبراً مجھ سے لکھوائی ہے۔ گویا یہ خراج ہے جو انکی شاعری نے میری شاعری سے لیا ہے۔ ہر چند حضرت اقبال سلمہ تعالےٰ بطور شاعر کے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مگر میرے خیال میں انکی شاعری کا پایہ انکی شہرت سے بلند تر ہے:۔ قیصری"

چار اشعار کی فارسی غزل بطور تمہید درج تھی اور اس کے بعد مسدس کے چھ بند تھے۔ دوسرا بند یہ تھا:

بلبلِ پنجاب تُو پنجاب ہے گلشن ترا
پُر ہے نو گلہائے مضموں سے سدا دامن ترا
جسکا دانہ دانہ خرمن ہے وہ ہے خرمن ترا
دوسروں کے سو تصنع ایک سادہ پن ترا
نقشِ تصویرِ مضامیں کے لئے مانی ہے تُو
خطہ ہندوستاں میں غالبؔ ثانی ہے تُو

اسی مہینے خدنگِ نظر نے 'ماہِ نَو' چھاپی۔

۶۱

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

اِس غزل کے چودہ شعر دستیاب ہیں۔ جون کے مخزن میں شائع ہوئی۔[۶۷]

۶۲

کچھ ہفتے پہلے دریائے نیل پر طلوع ہونے والے ہلال کی روشنی پر رشک کیا تھا۔ اب ماہِ کامل کو مخاطب کر کے کہا:

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

یہ بھی مثنوی کی ہیئت میں تھی اور اِس میں سترہ شعر تھے۔ دو بند تھے۔ اِس کا عنوان 'چاند' تھا اور یہ جولائی میں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

مخزن میں شائع ہوئی۔[۶۸]

وہ مقصد کیا تھا جو اقبال کو معلوم ہو گیا تھا؟

۶۳

عطا محمد اُن دنوں ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اقبال اُن کے پاس چلے گئے اور بیمار پڑ گئے۔[۶۹] غالباً اِسی کیفیت میں ایک روز اُس جگہ بیٹھے تھے جہاں اب میونسپل باغ ہے۔ عین سامنے پہاڑ سربن کی چوٹی تھی۔ مشرق کی جانب سے گھٹا آئی اور پہاڑ اُس میں چھُپ گیا۔ اِن کی طبیعت رواں ہو گئی۔

اُٹھی پھر آج وہ پُورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہُوا پھر پہاڑ سربن کا

مثنوی کی ہیئت میں سولہ اشعار کی نظم ہوئی۔ اس کا عنوان 'ابر' رکھا۔[۷۰]

۶۴

ایبٹ آباد میں لیکچر کی فرمائش کی گئی۔ اقبال نے 'قومی زندگی' کے عنوان سے ایک لیکچر دیا۔ ''قوم'' سے مراد ہندوستان کی مسلمان قوم تھی۔ دُنیا کی مختلف قوموں کا تجزیہ کیا کہ وہ کس طرح کے حالات سے دوچار ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ نئے دور کے لحاظ سے اسلامی قانون کی نئی تدوین کی طرف توجہ کریں۔ ''اگرچہ شیعہ مفسرّوں نے (فقہ کے) بعض اصول کی تشریح میں ایک حیرت ناک وسعتِ نظر سے کام لیا ہے تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعتِ اسلامی کی جو توضیع جناب ابوحنیفہؒ نے کی ہے ویسی کسی اسلامی مفسرّ نے آج تک نہیں کی۔ ہمیں اس وقت ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے۔''[۷۱]

۶۵

ہندوستان اور پوری دنیا میں ایک اور اہم سوال جو شاید انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس شدت کے ساتھ سامنے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

آرہا تھا وہ تھا معاشرے میں عورتوں کے مقام کا سوال۔

ابھی پچھلے برس ایک خاتون سائنسداں مادام کیوری نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔ اور اسی برس انگلستان کی انقلابی رہنما ایمیلیا نے عورتوں کے لیے ووٹ کا حق حاصل کرنے کی جدّ وجہد میں بعض عملی اقدامات اُٹھانے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ ہندوستان میں بہت عرصہ سے پردے کے مسئلے پر بحث ہورہی تھی۔ اس بحث میں ایک اہم آواز مولوی ممتاز علی کی تھی جنہوں نے بڑی مخالفت کا سامنا کر کے لاہور سے پرچہ تہذیبِ نسواں نکالا تھا۔

دُوسری اہم آواز لکھنؤ کے ایک بانکی طبیعت رکھنے والے ادیب کی تھی۔ ان کا نام عبدالحلیم شرؔر تھا۔ شبلی کے دوست تھے۔ شبلی ہی کی طرح انگریزی، فرانسیسی اور اسلامی تاریخ کا ذوق رکھتے تھے۔ مگر تحقیق کی بجائے ناول کو اپنا میدان بنایا تھا۔ صحافی بھی تھے اور بہت سے رسالے، پرچے وغیرہ نکالتے رہتے تھے۔ ایک رسالے میں پردے کی مخالفت میں لِکھ دیا کہ پردہ تو نگاہ اور ذہن کا پردہ ہوتا ہے نہ کہ گھر کی چار دیواری میں عمر قید! اِس پر ایک بزرگ دوست اکبر حسین الہ آباد سے ٹکٹ کٹوا کر ان کے گھر جا دھمکے اور سیدھے زنانے میں گھُستے چلے گئے۔ عورتوں نے شور مچا کر شرؔر کو بلایا تو اکبر الہ آبادی کہنے لگے۔ ''جب آپ اپنے گھر میں اِس اصُول پر عمل نہیں کر سکتے تو لکھتے کیوں ہیں؟''

الہ آباد واپس پہنچ کر انہوں نے شرؔر کو لکھ بھیجا:

اُٹھ گیا پردہ تو اکبؔر کا بڑھا کون سا حق
بے پُکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صرف حُکّام سے ملنے میں مزا آتا ہے

۶۶

اقبال کے خیال میں عورتوں اور مردوں کے میدان الگ الگ تھے۔[۲۷] پردے کے بارے میں ان کا خیال تھا:

''بعض مسلمان جو مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے ہیں اس دستور کے مخالف ہیں اور اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اور حال کے دیگر اسلامی ممالک میں پردے کی یہ صورت نہیں تھی جو

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

آج کل ہندوستان میں ہے۔ لیکن ... چونکہ اقوامِ ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ بہت ترقی نہیں کی، اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لیے نہایت مضر ہوگا۔ ہاں اگر قوم کی اخلاقی حالت ویسی ہو جائے جیسی کہ ابتدائے زمانہ اسلام میں تھی تو اس کے زور کو کم کیا جا سکتا ہے اور قوم کی عورتوں کو آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کی عام اجازت ہو سکتی ہے۔

''ان تمام اصلاحوں کے علاوہ شادی کی بعض قبیح رسوم توجہ کی محتاج ہیں۔ نارضامندی کی شادیاں مسلمانوں میں عام ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے ۹۹ فی صد اسلامی گھروں میں اس بات کا رونا رہتا ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں نہیں بنتی۔ منگنی کا دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ شادی سے پہلے میاں بیوی کو اپنے بزرگوں کے سامنے ملنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کی عادات اور مزاج کا مطالعہ کر سکیں اور اگر ان کے مذاق قدرتاً مختلف واقع ہوئے ہیں تو منگنی کا معاہدہ فریقین کی خواہش سے ٹوٹ سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق فانکحو اما طالب لکم من النسائ پر پورا عمل نہیں ہو سکتا۔ لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہی ہو، منگنی کے بعد تو اُس کو اس گھر سے ایسی پرہیز کرنی ہوتی ہے جیسے ایک متقی کو مے خانے سے۔ افغانوں میں منگنی کے بعد میاں بیوی کو آپس میں ملنے کی عام اجازت ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ مغلیہ دستور اسلامی نہیں بلکہ اسرائیلی ہے... تاہم اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دستور مفید ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں مغربی 'کورٹ شپ' کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور اس کے نقائص معدوم۔''[۷۳]

۶۷

لالہ ہردیال نوجوان تھے اور وطن کی محبت میں بہت آگے۔ اُنہیں افسوس تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اُن کے صوبے پنجاب نے عام طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ خود اِس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک روز ینگ مینز کرسچین اسوسی ایشن کے سیکرٹری سے اُلجھ پڑے۔ یوں تو اُس ایسوسی ایشن میں ہندوستانی بھی شامل تھے مگر بہت سے انگریز ہندوستانیوں سے میل جول کو اپنے لیے توہین کا باعث سمجھتے تھے۔ وائسرائے اور گورنر کی کونسلوں میں ہندوستانیوں کا گزر ہونے لگا تھا مگر نسلی امتیاز میں فرق نہیں آیا تھا۔

ہردیال کسی نسلی امتیاز کی بات ہی پر سکرٹری سے اُلجھے تھے چنانچہ رُکنیت سے استعفیٰ دیا اور مقابلے پر ینگ منز

(c) 2014. Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

انڈین ایسوی ایشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اُسی شام چھ بجے اس کا افتتاحی اجلاس بھی رکھ دیا۔

کوئی دوپہر کے تین بجے ہوں گے جب اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اجلاس کی صدارت کریں۔ مقررہ وقت پر وہ آئے تو جلسہ اُن کا منتظر تھا۔ اِنہوں نے تقریر کرنے کی بجائے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ترنم سے ایک نظم پڑھنا شروع کی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہندوستان کے پرندے یک زبان ہو کر سوداگر کو جواب دے رہے ہوں۔[۷۴]

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اِس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دِل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اُس کے ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رُودِ گنگا! وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کِنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یُونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مِٹتی نہیں ہماری
صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا![۷۵]

جلسہ کے اختتام پر ہر شخص اسے دوبارہ سُننے پر مصر تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر اقبال نے اپنے خاص سُروں میں یہ گیت چھیڑا۔ ایک طالب علم محمد عمر نے نظم سن کر لکھ لی اور عبدالحلیم شرؔر کو لکھنؤ بھیج دی جنھوں نے اپریل سے ایک نیا پرچہ اتحاد نکالنا شروع کیا تھا۔[۷۶]

۱۰ اگست کو اقبال نے یہ نظم اپنے ہاتھ سے کہیں لکھی۔[۷۷]

چھ دن بعد عنوان کے بغیر اور کچھ غلطیوں کے ساتھ اتحاد میں شائع ہوگئی۔ شرر نے جلسے کا ذکر کر کے نظم کی کیفیت بیان کی تھی اور پھر لکھا تھا، ''اِس نظم سے چونکہ اتحاد کو اپنے مشن میں مدد ملی ہے لہٰذا ہم اپنے پرانے دوست مولوی محمد اقبال صاحب کا شکریہ ادا کر کے درج اتحاد کرتے ہیں۔''[۷۸]

اُسی مہینے رسالہ دلگداز میں حسرت موہانی کے رسالے کی تعریف اور اقبال کی نظم پر تنقید شائع ہوئی: ''۱۶ اگست کے اتحاد میں ہمارے قدیم دوست محمد اقبال صاحب کی ایک مختصر نظم چھپی ہے جو ہندو مسلمان کے اتفاق پر ہے۔ اِس کے آخری دو شعروں میں ردیف بگڑ گئی ہے۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

''اِس میں ہمارا کی جگہ 'ہم پر' یا 'ہمارے حال پر' چاہیے۔

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا!

''اِس شعر میں 'ہمارا' کی جگہ 'اپنا' چاہیے۔ میں مانتا ہُوں کہ اقبال صاحب ملک کے نہایت ہی نازک خیال اور باکمال شعرا میں ہیں اور ایسی دو چار فروگزاشتوں سے اُن کا کمال مِٹ نہیں سکتا اور نہ یہ کسی کی کوشش ہونی چاہیے کہ اُن کے کمالوں پر خاک ڈالے لیکن اِن غلطیوں کو بتانا چاہیے تا کہ خود اقبالؔ صاحب کو اور دیگر شعرا کو ایسی فروگزاشتوں سے بچنے کا موقع مل سکے۔''[۷۹]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

منشی دیانرائن نگم کانپور سے اخبار زمانہ نکالتے تھے۔ اُن کی حبُّ الوطنی مشہور تھی۔ اُن کے اخبار میں کتابت اِتنی اغلاط کے ساتھ ہوئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے سن کر لکھی گئی۔ شعروں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ بظاہر "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" سے پہلا مصرع شائد نہ مل سکنے کی وجہ سے اس کی بجائے "پنجاب کیا، دکن کیا، بنگال بمبئی کیا" لکھ دیا گیا اور عین وقت پر صحیح مصرع دستیاب ہوا تو حاشیے میں لکھا، "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیَر رکھنا۔" نظم کے ساتھ نگم نے جو طویل نوٹ لکھا وہ اِس گیت کے بارے میں اُن جذبات کا پہلا بھرپور اظہار تھا جو اُس کے بعد ہر ہندوستانی اِس نظم کے متعلق محسوس کرنے والا تھا۔ "انگلستان میں ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان پر ہوتے ہیں،" نگم نے لکھا تھا۔ "کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو انہوں نے ہمارے پیارے اور پرانے دیس پر لکھی ہے ملک بھر میں ہر دلعزیز اور مفید ثابت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹے بڑوں، خاص و عام ہر ایک کے مفید ہونے کی مستحق ہے۔" زمانہ کا یہ شمارہ ستمبر میں شائع ہوا۔[۸۰]

۶۸

وہ راز جس کی طرف وہ اپنی نظموں میں بار بار اشارہ کر رہے تھے اُسے ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کر دیا۔ نظم غزل کی ہیئت میں تھی جس کا عنوان 'سرگزشتِ آدم' تھا۔ انسان کی زبانی کہلوایا تھا کہ شعور کا جام پینے کے بعد جنت میں طبیعت نہ لگی اور دُنیا میں چلا آیا۔ تاریخ کے تغیرات حقیقتِ عالم کی جستجو کا نتیجہ تھے مگر:

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں مَیں نے

بات یہاں ختم نہ ہوتی تھی۔ مزید پانچ اشعار غزل کی طرز میں کہے اور تان اِس پر ٹُوٹی:

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیرِ اقبالؔ
مَیں بُت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں مَیں نے

صنم خانۂ امیر سے امیر بیگم کے آستانے کے علاوہ امیرؔ مینائی کا دیوان صنم خانۂ عشق بھی مراد لیا جاسکتا تھا لہٰذا نظم مخزن میں شائع کروائی جاسکتی تھی۔ ستائیس اشعار ہوئے تھے۔[۸۱]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۶۹

جب رسول اکرمؐ مدینۂ منوّرہ میں جلوہ افروز تھے تو کوئی بھی عاشق خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نگاہوں کی پیاس بُجھا سکتا تھا۔ اِس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت بلال حبشیؓ پر نظم لکھی تو جذبات میں ڈوبی ہوئی نعت بن گئی:

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظم مثنوی کی ہیئت میں تھی۔ اِس کے تین بند بنائے جن میں سے پہلے اور آخری میں اشعار کی تعداد برابر تھی یعنی چار جبکہ درمیانی بند میں سات شعر تھے۔ عنوان 'بلال' تھا۔[۸۲]

'سرگزشتِ آدم' اور 'بلال' دونوں ستمبر میں مخزن میں شائع ہوئیں۔

سیالکوٹ سے قاضی حمید الدین کی ادارت میں ماہنامہ الکاشف جاری ہو رہا تھا۔ اقبال کی ایک غزل بھی اشاعت کے لیے مل گئی جس میں سترہ شعر تھے اور مقطع میں سید میر حسن کی طرف اشارہ ہے:

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں ہیں وہ کچھ بن کے نکلے ہیں

اِس غزل کے تین اور شعر بھی دستیاب تھے۔[۸۳]

۷۰

اقبال نے دلگداز کے دونوں اعتراضات قبول کر کے مصرعے بدل دیے۔ اِس کے علاوہ چند اور الفاظ بدل کر نظم کی بندش چست کر دی مگر اشعار کی ترتیب وہی رکھی جو پہلے تھی۔ تسلی ہوئی تو مخزن میں اشاعت کے لیے دی۔ عبدالقادر نے نوٹ لکھ بھیجا، "جذباتِ دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو وہ خیالات ظاہر کیے ہیں جو وطن سے دُور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ اگر میں نظم لکھتا تو لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کیے ہیں۔"

یہ نوٹ اور 'ہمارا دیس' اکتوبر کے مخزن میں اقبال کے ایبٹ آباد والے لیکچر کے خلاصے پر مبنی مضمون 'قومی زندگی' کے پہلے حصے کے ساتھ شائع ہوئے۔ بعد میں کبھی مزید ایک لفظ اور عنوان بدلا۔ نظم حتمی صورت کو پہنچی۔[۸۴]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۷۱

نشانِ ماہِ کنعاں، اے زلیخا، پوچھ لے مجھ سے!
کہ مَیں نے چاہِ دل سے سیکڑوں یوسف نکالے ہیں

اِس غزل کے سترہ شعر دستیاب ہیں۔ یہ دکن ریویو میں شائع ہوئی۔[۸۵]

۷۲

اکتوبر میں اقبال ایک دوست سے ملنے ہوشیارپُور جانے والے تھے۔ پہلے کئی دفعہ وعدہ کر کے عین وقت پر ارادہ بدلا تھا۔ گورنمنٹ کالج کی سینیٹ کا آیندہ اجلاس ۷ نومبر کو ہونے والا تھا۔ اقبال کو معلُوم ہُوا کہ مسٹر شاہ دین فیلوشپ کے لیے اُن کا نام تجویز کریں گے مگر اسے منظور کروانے کے لیے اُنہیں سینیٹ کے دوسرے ارکان کو ملاقات کر کے ہموار کرنا ہوگا۔

اقبال اِس دوڑ دھوپ پر آمادہ ہوگئے مگر طے کیا کہ وہ براہِ راست ارکان سے ملنے کی بجائے اُن کے دوستوں سے ملیں۔ ''ذاتی طور پر مجھے یہ زیب نہیں دیتا،'' اُنہوں نے اپنے دوست کو انگریزی میں لکھا۔ ''مگر آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ مسلمان فیلوز کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کل چھ... جن میں سے تین مولوی ہونے کے اعتبار سے عملاً گویا نہیں ہیں... اِس زمانے میں قومی مفادات سب پر مقدم ہیں۔ دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کو پسِ پشت ڈال دینا چاہیے۔''[۸۶]

اکتوبر کا مہینہ اِسی گناہِ بےلذّت کی نذر ہُوا۔

۷۳

تنقید ہمدرد کے نام سے جو بھی صاحب لکھتے تھے وہ 'ہمارا دیس' کو نظم کی بجائے غزل سمجھے۔ کچھ اس لیے کہ اتحاد میں یہ بغیر عنوان کے چھپی تھی جس کے بعد اِسے مخزن میں دیکھ کر اُنہوں نے ساری توجہ الفاظ کو تنقیدی نظر سے دیکھنے میں صرف کر دی اور سرخی نہ دیکھ پائے۔ کچھ اِس لیے بھی کہ نظم کے اشعار کا اندرونی ربط تلاش کرنا ہندوستان کے عام مزاج کے مواقف نہ تھا۔ نومبر کے اُردوئے معلیٰ میں مخزن کے حوالے سے لکھا، ''اکتوبر کا پرچہ

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان اور ناواقف لوگوں سے قطعِ نظر کر کے جو نکتہ چینی کا جواب سب وشتم سے دینا چاہتے ہیں اہلِ پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحتِ زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینیوں سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا:

اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

''دلگداز نے اعتراض کیا کہ اس شعر میں 'ہمارا' کی بجائے 'اپنا' چاہیے اور اقبال نے اب اس کو بدل کر مخزن میں اِس طرح چھپوایا:

اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

''حضرت اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں۔ کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں ویسی ہی نثر میں بھی کرتے کیونکہ ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ اِسی پرچے میں اُن کے لیکچر موسوم بہ قومی زندگی میں بہت سے اغلاط موجود ہیں...''

اِس کے بعد لیکچر کی زبان کی خامیاں بیان ہوئی تھیں۔[۸۷]

اقبال نے لیکچر کی دُوسری قسط چھپوانے کا اِرادہ ملتوی کر دیا۔

۷۴

گرامی لاہور آئے تو اپنے دوست کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اقبال ہمیشہ کی طرح ہنستے مسکراتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کئی دنوں سے امیر سے ملاقات نہیں ہُوئی تھی۔ اُس کی ماں کو اُس کا اقبال سے ملنا پسند نہیں تھا۔

گرامی اُسی وقت علی بخش کو لے کر نکل گئے اور امیر کی ماں سے جا کر کہا، ''تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے ٹھانی ہے؟'' نائکہ نے جواب دیا، ''مولانا!... آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے، میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟'' گرامی نے خود ذمہ داری قبول کی تو اُن کی ڈاڑھی کے لحاظ میں امیر کو دو گھنٹے کی اجازت مل گئی۔ اقبال کے

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

پاس پہنچ کر گرامی نے اُنہیں جھنجھوڑا اور بولے، ''اُٹھو جی، آ گئی امیر!''

اقبال کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا مگر امیر اُن کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھیں۔[۸۸]

غزل

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، اِرادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
خموش اے دل! بھری محفل میں چلّانا نہیں اچّھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں
برا سمجھوں اُنہیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہُوں اقبالؔ اپنے نکتہ چینوں میں

اِس غزل کے اکیس اشعار دستیاب ہیں۔[۸۹]

۷۵

فوقؔ نے یادِ رفتگاں کے عنوان سے تذکرہ مرتب کیا جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو صوفیوں کو بھی جگہ دی۔ اقبال نے پڑھا تو لکھا، ''بھائی فوقؔ۔ خود بھی اُس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانے میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں میں اتفاقاً مل جاتا ہے۔''

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۷۶

دنیا میں ہر چیز کو حقیقتِ مطلق سے وصال کی تمنا ہے۔ یہ خیال ایک موج کی زبانی کہلوایا گیا جس نے سمندر کے عشق میں اپنی بے تابی بیان کی تھی۔ ''موجِ دریا'' مسدس کی صورت تھی اور اس میں تین بند تھے۔[۹۰]

دوسری طرف یہ بھی درست تھا کہ جس کی تلاش تھی وہ ہر چیز میں موجود بھی تھا۔ اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے تھے ورنہ نغمہ بلبل کی خوشبو اور بُو پھول کی چہک تھی۔ آسمان پر چاند شاعر کے دل کی مانند تھا، وہاں جو چیز چاندنی بنی تھی وہی شاعر کے دل میں درد بن گئی تھی:

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

یہ بات جگنو کے حوالے سے کہی تھی جو شب کی سلطنت میں دن کا سفیر بن کر آتا تھا۔ نظم 'جگنو' ترکیب بند تھی۔ اس میں تین بند تھے۔ سترہ شعر تھے۔ پہلے دونوں بند چھ چھ شعر کے تھے اور آخری بند میں پانچ شعر تھے۔[۹۱]

حقیقت کی جھلک ہر شے میں تھی مگر انسان کو خودشناسی ملی تھی جو درد سے پرورش پاتی تھی۔ یہ بات صبح کے ستارے کی زبانی کہلوائی تھی جو صبح کے دامن سے کفن پہننے کی بجائے کسی ایسی بیوی کی آنکھ کا آنسو بننا چاہتا تھا جس کا شوہر جنگ پر روانہ ہو رہا ہو اور وہ اُسے رخصت کرتے ہُوئے رو بیٹھے۔ نظم 'صبح کا ستارہ' مثنوی کی ہیئت میں تھی جس کے پہلے بند میں سات، دوسرے میں چھ اور تیسرے میں نو شعر تھے۔[۹۲]

'موجِ دریا' دکن ریویو کے نومبر دسمبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ 'جگنو' اور 'صبح کا ستارہ' دسمبر میں مخزن میں شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ پرانی نظم 'یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' کا پہلا بند 'ہلالِ عید' کے عنوان سے شائع ہوا۔

۷۷

اقبال نے حضرت علیؓ کی شان میں میں ایک منقبت فارسی میں لکھی تھی جسے وہ ان دنوں صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے، ''اے کہ آپ کی ثنا میں زبان محو ہے، اے کہ آپ روح کے کارواں کے یوسف ہیں...'':

اے محوِ ثنائے تو زباں ہا
اے یوسفِ کاروانِ جاں ہا[۹۳]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۷۸

۱۹۰۴ء کے اواخر میں امیر بیگم اور اقبال کا تعلق امیر کی والدہ کی دخل اندازی سے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔[۹۴]

۷۸

اقبال کی جذباتی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کے ذہن کی ہمہ گیر وُسعت کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ تو ممکن تھا کہ نسوانی حسن اُن کی فطرت کے لیے بجلی بن کر اُنہیں عظیم الشان نفسیاتی تجربے سے دوچار کر دیتا مگر یہ ممکن نہ تھا کہ محض کسی کے ہجر کا غم اُن کی زندگی کا رُخ بدل دیتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۴ء کے اختتام پر اُن کی زندگی میں کئی مایوسیاں جمع ہو گئی تھیں۔ اُنہیں جس فیلوشپ کا آسرا ہوُا تھا وہ انہیں نہیں ملی تھی۔ عزیز دوست (عبدالقادر) انگلستان گئے تھے اور اپنی بے پناہ ذہانت کے باعث یہ بھی اپنا حق سمجھتے تھے کہ مغرب کے میکدۂ علم سے جرعے حاصل کرنے کا موقع ملے۔ اِس معاملے میں تقدیر اُن سے ناانصافی پر آمادہ نظر آتی تھی جس کی شکایت اُن دنوں کی نظموں میں موجود ہے۔ اِن سب سے قطعِ نظر ہندوستان کے سیاسی پس منظر پر ہندو اور مسلمان کے درمیان بڑھتے ہوئے تعصّبات اور جہالت کی کارفرمائیاں انہیں اپنے گردوپیش سے اور بھی بیزار کر رہی تھیں۔ یہ تعصب اور جہالت یقیناً ایک ایسے حساس شخص کے لیے جس کا نفیس فلسفہ ہندو کو خدا پرست مانتا تھا ایک ذاتی اذیّت سے کم نہ تھیں۔ ہندو اور مسلم کی معرکہ آرائی کا خیال اُن کی اپنی شخصیّت میں ایک تکلیف دہ توڑ پھوڑ کا استعارہ تھا۔

بہر حال یہ عجیب اتفاق ہے کہ امیر بیگم سے قطع تعلّق کے بعد آیندہ سات برس تک نہ وہ انجمن کے اجلاس میں نظم سُنا سکے نہ کوئی طویل نظم لکھ سکے۔

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی خزف چینِ لبِ ساحل ہُوں مَیں
مَیں وہی ہُوں کھو گیا تھا جس کا دِل روزِ الست
تم نہ پہچانو تو تم جانو، وہی بے دِل ہُوں مَیں
ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

مجھ پر آ کر، گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہُوں مَیں
ڈھونڈھتا پھرتا ہے کیا اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہُوں میں

یہ غزل دسمبر میں مخزن میں شائع ہوئی۔ اِس کے چَودہ شعر دستیاب ہیں۔[95]

تتمہ

امیر بہت دن زندہ رہیں مگر اقبال سے نہ مل سکیں۔ یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اتنے بڑے شاعر نے اُنہیں جس توجہ کے لائق سمجھا تھا اُنہوں نے آخر عمر تک اُس کی لاج رکھی۔ کوئی اقبال کا ذکر کرتا تو مُسکرا کر خاموش ہو جاتیں۔ کبھی کسی کو اپنی اور اقبال کی ملاقاتوں کا حال نہ بتایا یہاں تک کہ جب اقبال کی وفات کے بعد اور پاکستان بننے کے بعد اقبال کی شخصیت کے نام پر لوگوں نے دولت اور شہرت سے اپنا دامن بھرنا شروع کیا امیر نے تب بھی کوئی واقعہ، کوئی فقرہ کہ کر اس دِلی تعلق کی تشہیر کرنا گوارا نہ کی۔ ایک صحافی نے ۱۹۴۸ء میں اُن سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے:

> امیر چھیاسٹھ برس کے سِن میں ہے... رنگ سنولا چکا بلکہ سیاہ ہوتا جا رہا ہے۔ بال سفید ہو چکے ہیں...
> ”خالہ یہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“
> امیر نے آنکھیں کھول دیں... ہم نے سوال کیا تو اُس کے بُوڑھے چہرے کی جھُرّیاں مُسکرائیں، جیسے کسی گُم شدہ کہانی کے الفاظ بکھر گئے ہیں اور وہ اُنہیں ایکا ایکی جوڑ دینا چاہتی ہے۔ اقبال کے نام سے اُس کی بُجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نور سا جاگ اُٹھا، لیکن بسرعت مدھم ہو گیا۔ گویا ایک چُپ، ہَو سُکھ۔
> اُس نے کچھ بتانا قبول نہ کیا۔ ہمارا اصرار بڑھا تو قدرے جھنجھلا کر کہا، ”ہمارے ہاں مُردوں کے کفن پھاڑنے کا رِواج نہیں۔ اِنسانی گوشت کی چاٹ بُری ہوتی ہے... اِس عمر میں انسان کو خوفِ خدا کے سِوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ جب خُدا کا خوف نہیں تھا تو سب کچھ یاد تھا۔“
> ہم نے بات کو طُول دینا چاہا اور تقاضا کیا کہ وہ اُن صحبتوں کی کوئی کہانی چھیڑے، جب اقبال، عبدالقادر گرامی، ناظر وغیرہ ہم حاضر ہوتے تھے لیکن اُس نے کھوکھلے قہقہوں میں ہمارے استفسار کو سمیٹا پھر ذرا ترُش ہو کر کہا، ”...میں کوئی کتاب نہیں کہ اُٹھایا، ورق پلٹے، جس پیرے یا صفحے پر نظر ٹھیری اُس کو کھنگالنا

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

شروع کیا۔ پُرانی باتیں وقت کے ساتھ مر چکی ہیں۔“

ہمیں یقین ہو گیا کہ امیر اِس معاملے میں سرِّ خفی ہے۔ اُس کا رُوپ مر چُکا ہے لیکن اُس کی آن نہیں مری، اُس کی خودی زندہ ہے۔[۹۶]

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

حاشیے

نوٹ:

☆ اس سوانح میں اقبال کا کلام گیان چند (۱۹۸۸) سے لیا گیا ہے۔ جہاں کوئی اور ماخذ ہے وہاں نشاندہی کی گئی ہے۔ جہاں تک ہو سکا ہے میں نے ابتدائی ماخذ بالخصوص مخزن کے اصل شماروں سے موازنہ کر لیا ہے اور حسب ضرورت تصحیح بھی کر دی ہے۔

☆ جن معلومات کا ماخذ اقبال کے خطوط ہیں وہاں صرف مکتوب علیہ کا نام اور خط کی تاریخ درج کی گئی ہے (مثلاً دیکھیے باب۲ ماخذ ۷)۔ ایسی تمام صورتوں میں ہمارا حوالہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (مرتبہ سیّد مظفّر حسین برنی مطبوعہ اُردو اکادمی دہلی) رہی ہے۔

☆ اقبال کی ابتدائی تعلیم (سیالکوٹ کے زمانۂ قیام) اور اُس زمانے کے نصاب سے متعلق معلومات عام طور پر سلطان محمود (۱۹۸۶ء) سے اخذ کی گئی ہیں۔

باب ا: زمین اور آسمان

۱ یہ وہی منتر ہے جسے گاتیری کہتے ہیں۔ اقبال نے 'آفتاب' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا اور کفر کا فتویٰ پایا۔ دیگر تفصیلات نیز سنسکرت متن کے لیے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۴

۲ اقبال کے خاندانی پس منظر کے بارے میں معلومات زیادہ تر جاوید اقبال (۱۹۷۹) اور اعجاز احمد (۱۹۸۴) سے لی گئی ہیں۔

۳ تاثرات مولوی سید میر حسن کے ہیں جو انہوں نے منشی محمد دین فوق کے نام خط میں درج کیے۔ سلطان محمود (۱۹۸۶) ص ۴۳ پر منشی محمد دین فوق کی کتاب ملک العلما علامہ عبدالحکیم (۱۹۲۴) ص ۲۶ کے حوالے سے درج ہے۔

۴ اعجاز احمد (۱۹۸۴)

۵ سلطان محمود (۱۹۸۶) ص ۱۷

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۶ انیسویں صدی کے سیالکوٹ کے بارے میں معلومات عام طور پر سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) سے لی گئی ہیں۔
۷ اعجاز احمد (۱۹۸۴)
۸ سید میر حسن کے بارے میں معلومات عام طور پر سلطان محمود حسین (۱۹۸۱) سے لی گئی ہیں۔
۹ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۵) نے ماہنامہ میثاق لاہور، دسمبر ۱۹۷۷ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی میر حسن کی غالب سے ملاقات کا حال پروفیسر سلیم چشتی نے خود مولوی صاحب سے سنا تھا۔
۱۰ یہ روایت سیدز کی شاہ کی ہے۔ دیکھیے عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)
۱۱ یہ واقعہ خود اقبال نے ۱۹۰۴ کے لیکچر 'قومی زندگی' میں بیان کیا۔ دیکھیے مقالاتِ اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳)
۱۲ تقریر کا اقتباس انور صدیقی (۱۹۸۷) کی انتخاب مضامین سر سید (ص ۱۱) سے لیا گیا ہے۔
۱۳ علی گڑھ کالج کے سنگِ بنیاد سے متعلق عام واقعات GRAHAM (1885/1909) بالخصوص باب ۱۳ سے لیے گئے ہیں۔
۱۴ روایت سیدز کی شاہ۔ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)
۱۵ یہ خواب بہت مشہور ہے۔ ہمارا ماخذ عبدالمجید سالک (۱۹۵۵) ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے خود اقبال سے سُنا تھا۔
۱۶ اقبال کی تاریخِ پیدائش متنازعہ ہے۔ اقبال کی تاریخِ پیدائش پر مفصّل بحث جاوید اقبال (۱۹۷۹ء) یا اعجاز احمد (۱۹۸۴ء) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال اکادمی لاہور سے اقبال کی تاریخِ ولادت کے عنوان سے مقالات کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔

مندرجہ ذیل تاریخوں کو اُن کی پیدائش سے متعلق سمجھا گیا ہے۔

۹ نومبر ۱۸۷۷ء (۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ)

اقبال نے میونخ یونیورسٹی میں اپنا مقالہ داخل کرتے ہوئے اپنی تاریخِ پیدائش "۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء)" لکھی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے گھر والوں سے تاریخ معلوم کروائی ہوگی۔ وہاں سے ہجری تاریخ بتائی گئی اور عیسوی سال اقبال نے خود اندازے سے نکال لیا۔ چنانچہ زندگی بھر خود اقبال اور اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اِسی لحاظ سے اقبال کی عمر کا حساب لگاتے رہے۔ اقبال نے اپنی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

زندگی میں سالِ ولادت ہمیشہ ۱۸۷۶ء لکھا یہاں تک کہ جب ۱۹۳۱ء میں اُن کا پاسپورٹ بنا تو اُس پر بھی یہی سال درج کیا۔

۱۹۶۳ء میں عطا محمد کے فرزند اعجاز احمد نے ایک تقویم سے صحیح عیسوی تاریخ نکالی جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بنتی تھی۔ یہ تاریخ انہوں نے فقیر سیّد وحید الدّین کی کتاب فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) میں شائع کروادی مگر اُس وقت تک بعض دوسری تاریخیں (خصوصاً ۱۸۷۳ء) اس قدر مشہور ہو چکی تھیں کہ چند سال بعد پہلے بزمِ اقبال لاہور کو اور اس کے بعد حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم کو باقاعدہ کمیٹیاں مقرّر کرنا پڑیں۔ بزمِ اقبال کی کمیٹی ۱۹۷۲ء کی آخری سہ ماہی میں بیٹھی جبکہ وزارتِ تعلیم کی کمیٹی نے جنوری ۱۹۷۴ سے یکم فروری ۱۹۷۴ء تک تین اجلاس منعقد کرنے کے بعد اِس تاریخ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس کمیٹی کے گیارہ ارکان تھے یعنی (۱) ڈاکٹر محمد اجمل (سیکرٹری تعلیم) چیرمین (۲) ریٹائرڈ جسٹس ایس اے رحمان (۳) جسٹس جاوید اقبال (اقبال کے بیٹے) (۴) پروفیسر حمید احمد خان (ناظم مجلس ترقیٔ ادب لاہور) (۵) ایس اے واحد (نائب صدر اقبال اکادمی پاکستان کراچی) (۶) پروفیسر محمد عثمان (معتمد بزمِ اقبال) (۷) ڈاکٹر سیّد عبداللہ (۸) پروفیسر وقار عظیم (۹) ڈاکٹر وحید قریشی (۱۰) خواجہ عبدالرحیم ایڈوکیٹ اور (۱۱) شیخ اعجاز احمد (اقبال کے بھتیجے)۔

یہ تاریخ سیالکوٹ کے رجسٹرِ پیدائش میں کہیں نہیں ملتی۔ اِس بات کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ شیخ نور محمد اپنے بچوں کی پیدائش کا اندرج کروانے میں بعض اوقات لاپرواہی برت جاتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی بعض بہنوں کی پیدائش کا اندراج بھی رجسٹر میں نہیں ملتا۔ اِس تاریخ کو درست تسلیم کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں: (۱) یہ تاریخ اقبال نے خود اپنے ہاتھ سے درج کی (۲) اقبال کی زندگی میں وہ خود اور اُن کے اہلِ خانہ اِسی تاریخ کو اُن کی پیدائش کی تاریخ سمجھتے رہے۔ اہلِ خانہ کی مزید شہادتیں اعجاز احمد (۱۹۸۵) میں درج ہیں۔ (۳) اِس تاریخ کو جمعے کا دن تھا۔ اقبال کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ وہ جمعے کے دن پیدا ہوئے تھے۔ اقبال کی دوسری جتنی بھی تاریخیں بیان کی جاتی ہیں وہ جمعے کے علاوہ دوسرے دنوں کی ہیں۔

پاکستان میں یہ تاریخ سرکاری طور پر اقبال کی پیدائش کی تاریخ تسلیم کی گئی ہے۔ اقبال کے اکثر سوانح نگار (مثلاً جاوید اقبال) اب یہی تاریخ استعمال کرتے ہیں۔

اِس تاریخ کے متعلق شبہات کا اظہار بھی بہت کیا گیا ہے۔ شبہات کی بنیاد مندرجہ ذیل امور پر

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ہے: (۱) اقبال کی زندگی میں اُن کا کلام تو بہت چھپا مگر اتفاق سے تاریخِ پیدائش کی اشاعت زیادہ نہیں ہوئی۔ اُن کی وفات کے بعد جو تاریخِ پیدائش مشہور ہوئی وہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء تھی۔ یہ تاریخ اتنا عرصہ لوگوں کے ذہنوں میں رہی کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اچانک اِسے ترک کرنا بعض لوگوں کو گوارا نہ ہو سکا۔ (۲) جن حالات میں حکومتِ پاکستان نے تاریخِ ولادت کی تحقیق کروائی اُن کی وجہ سے بھی شبہ پیدا ہُوا۔ ۱۹۷۲ء میں بھارت میں اعلان ہوا تھا کہ اگلے برس اقبال کا صدسالہ جشنِ ولادت منایا جائے گا۔ حکومتِ پاکستان کو اُس وقت خیال آیا جب اگلے برس بھارت میں جشن شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ حکومت کو اِتنے بڑے جشن کا اہتمام کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ لٰہذا یہ بات حکومت کی خواہش کے عین مطابق تھی کہ تاریخ پیدائش ایسی نکل آئے جسے ابھی سو سال پورے ہونے میں کچھ وقت باقی ہو مثلاً اگر فروری ۱۹۷۴ء میں وزارتِ تعلیم کی کمیٹی یہ اعلان کرتی کہ اقبال ۱۸۷۳ء ہی میں پیدا ہوئے تھے تو حکومتِ پاکستان کے پاس اِس بات کا کیا جواب تھا کہ یہ تحقیق پہلے کیوں نہ ہوئی اور اقبال کا جشن بھارت میں منایا گیا تو خود پاکستان میں کیوں نہ منایا گیا۔ (۳) ایک الجھاوا یہ بھی ہے کہ اقبال نے نومبر ۱۸۹۰ء میں مڈل کے امتحانی فارم میں اپنی عمر پندرہ سال درج کی تھی۔ دو ڈھائی سال بعد انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو گزٹ میں اُن کی عمر سترہ سال بتائی گئی۔ اِس لحاظ سے اُنہیں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں جب اقبال ابھی زندہ تھے لاہور کے انٹر کالجیٹ مسلم برادرہُڈ نے ملک بھر میں یومِ اقبال منانے کا اہتمام کیا تھا مگر یہ یومِ ولادت کے طور پر نہیں منایا گیا تھا بلکہ کسی مناسب دن کو منتخب کر کے اقبال کے پیغام کی ترویج کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

دسمبر ۱۸۷۶ء

اصل میں یہ تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی ہے۔ اقبال کی وفات کے بعد روزنامہ انقلاب کے رپورٹر نے اُن کے بھائی سے تاریخِ پیدائش دریافت کی تو انہوں نے ہجری تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازے سے دسمبر ۱۸۷۶ء کہہ دیا۔ یہ تاریخ رونامہ انقلاب کے اپریل ۱۹۳۸ء کے شماروں میں شائع ہوئی۔

۲۲ فروری ۱۸۷۳ء

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

یہ تاریخ سب سے پہلے روزنامہ انقلاب کی ۷ مئی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا مآخذ یہ تھا کہ سیالکوٹ میں کسی نے رجسٹرِ پیدائش میں اس تاریخ کے سامنے ایک لڑکے کی پیدائش کا اندراج دیکھا تھا۔ لڑکے کے باپ کا نام نتھّو درج تھا۔ اس اندراج کو اقبال کی پیدائش کا اندراج سمجھا گیا۔ شیخ عطا محمد کے نواسے خالد نظیر صوفی کا خیال ہے کہ یہ اصل میں اُس لڑکے کی پیدائش کا اندراج ہے جو بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ (دیکھئے اِسی باب کی فصل نمبر ۳۷ اور ۳۹) مگر پروفیسر عثمان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اندراج سرے سے شیخ نور محمد کے گھر کا ہی نہیں ہے کیونکہ رجسٹرِ پیدائش میں کم از کم پچیس نتھو ملتے ہیں جو سبھی سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ اقبال کے والد بھی اگرچہ نتھو کے نام سے مشہور تھے مگر وہ محلّہ چوڑی گراں میں رہتے تھے جبکہ ۱۸۷۳ء والے اندراج میں نتھو کا پتہ محلّہ کشمیریاں ہے۔

۱۹۵۵ء میں بزمِ اقبال لاہور کے زیرِ اہتمام ذکرِ اقبال شائع ہوئی جسے اقبال کی پہلی باقاعدہ (اسٹینڈرڈ) سوانح کہنا چاہیے۔ اتفاق سے اس کے مصنف عبدالمجید سالک تھے جو انقلاب کے بانی اور مدیر تھے۔ انہوں نے کتاب میں بھی یہی تاریخ درج کی اور وہاں سے یہ تاریخ ہر جگہ نقل ہونے لگی۔ ۱۹۷۴ء تک یہی تاریخ درست سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ بھارت میں اقبال کا صد سالہ یومِ پیدائش اِسی حساب سے ۱۹۷۳ء میں منایا گیا۔

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء

یہ تاریخ سب سے پہلے ۱۹۷۱ء میں اقبال درونِ خانہ میں شائع ہوئی۔ کتاب کے مصنف خالد نظیر صوفی تھے یعنی شیخ عطا محمد کے نواسے اور اعجاز احمد کے بھتیجے۔ اُن کا مآخذ بھی سیالکوٹ کا رجسٹرِ پیدائش تھا جس میں اِس تاریخ کو ایک اور لڑکے کی پیدائش کے اندراج میں والد کا نام نتھو درج تھا۔ اِس اندراج کے متعلق بھی پروفیسر عثمان کی تحقیق یہی ہے کہ یہ نتھو کوئی اور ہے کیونکہ اس کا پتہ اگرچہ چوڑی گراں ہے مگر "پیشہ۔ قوم و مذہب" کے خانے میں خیاط درج ہے جسے پیشہ نہیں قوم (ذات) سمجھنا چاہیے۔ نور محمد ہوتے تو وہ اس خانے میں کشمیری لکھواتے جیسا کہ اُن کے والد محمد رفیق نے ۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو اُن کی لڑکی کی پیدائش کے اندراج میں لکھوایا تھا۔

۱۸۷۵ء

یہ تاریخ کم معروف ہے اور بہت کم محققین اِسے قبول کرتے ہیں، مثلاً سلطان محمود حسین۔ اِس کا مآخذ اقبال کی مڈل کی سند اور انٹرنس کے نتیجے والا گزٹ ہے۔ مڈل کی سند اُس امتحانی فارم کی بنیاد پر جاری کی گئی

(c) 2012 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

جسے اقبال نے نومبر ۱۸۹۰ء میں بھرا ہوگا۔ انٹرنس کا نتیجہ دوڈھائی سال بعد نکلا تھا۔ فارم میں عمر پندرہ سال لکھی گئی ہے جس کے مطابق اقبال کو ۱۸۷۵ء میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ انٹرنس کے نتیجے سے بھی یہی حساب نکلتا ہے۔ اِس کے جواب میں شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ اقبال کو پہلی جماعت میں شاید مولوی میر حسن نے داخل کروایا ہوگا اور اندازے سے اُن کی عمر لکھوادی ہوگی۔ اقبال اچھے قد کاٹھ کے تھے لہٰذا مولوی صاحب کو عمر میں مغالطہ لگ سکتا تھا۔ پھر اسکول کے رجسٹر میں یہی عمر چلتی رہی اور مڈل اور انٹرنس (میٹرک) کے رزلٹ تک لکھوائی جاتی رہی۔ بعد میں بی اے کی درخواستِ داخلہ میں ۱۸۹۶ء میں انیس سال عمر لکھوائی۔ اس لحاظ سے اُن کا سالِ پیدائش ۱۸۷۵ء نہیں بلکہ ۱۸۷۷ء بنتا ہے۔

اِس کے جواب میں سلطان محمود کا استدلال یہ ہے کہ اولین فارم پر درج کی ہوئی عمر ہی درست تھی اور بعد میں اِسے دوسال کم اِس لیے کیا گیا کہ اقبال کے دِل میں سرکاری ملازمت کے حصول کا خیال پیدا ہوگیا تھا اور سرکاری ملازمت میں عمر کم بتانے میں جو فائدہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

۱۹۰۷ء میں اقبال کے جوانی کے دِنوں کے دوست منشی محمد دین فوق نے کشمیری میگزین (لاہور) میں اقبال کے حالاتِ زندگی شائع کیے تھے۔ بعد میں یہی حالات ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں اپنی کتاب مشاہیرِ کشمیر میں شائع کیے۔ اِس کے بعد بھی اقبال کی زندگی میں اِن میں دو دفعہ اور ترمیم ہوئی۔ منشی فوق نے اقبال کی تاریخِ پیدائش ۱۸۷۵ء ہی بتائی ہے اور ہر مرتبہ اِسی لحاظ سے اُن کی عمر لکھی ہے۔

۱۷ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) لکھتے ہیں کہ محمد اقبال نام امام بی بی نے تجویز کیا تھا مگر کوئی سند نہیں دی۔

۱۸ حمید احمد خاں (۱۹۷۴) ص ۵۰۔ اُنہیں اقبال نے خود یہ بات بتائی تھی۔

باب ۲: ماں کی آغوش کی وُسعت

۱ حمید احمد خان (۱۹۷۴) ص ۵۰

۲ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۔ اُن کا مآخذ ہے غلام دستگیر رشید (۱۹۶۴) آثارِ اقبال۔

۳ نذیر نیازی (۱۹۶۱) ص ۷۰-۶۹

۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۸۰-۱۷۹۔ یہ روایت اقبال اور عطا محمد کے بھانجے منظور احمد کی ہے۔ وہ طالع بی کے بیٹے تھے۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۵ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۵۰

۶ ایضاً ص ۴۹

۷ اقبال بنام مہاراجہ کشن پرشاد ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء

۸ سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۱۵

۹ نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۱۰۔ اُنہوں نے ۱۹۷۳ میں کریم بی سے انٹرویو کیا تھا جب محترمہ کی عمر نوّے برس سے اُوپر تھی۔ غلط اور غلت والا واقعہ بھی نذیر نیازی ہی نے ص ۵۲ پر لکھا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اُنہوں کس سے سنا۔ نہ ہی یہ لکھا ہے کہ اقبال نے یہ بات کب اور کس اُستاد کے سامنے کہی۔

۱۰ اقبال بنام شاہ سلیمان پھلواری ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء

۱۱ سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۱۵

۱۲ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۰) ص ۷۵

۱۳ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۳۔ یہ روایت سیّد ذکی شاہ کی ہے۔

باب ۳: خاندانِ مرتضیٰ کی بارگاہ

۱ مولوی سیّد میر حسن کے حالات عام طور پر سلطان محمود (۱۹۸۱) سے اخذ کیے گئے ہیں۔

۲ اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۴۹

۳ ایضاً۔ باب نمبر ۸، ۷، ۶

۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۴۵۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۵ مسلم ایجوکیشنل کانگریس (کانفرنس) کے اجلاسوں کی کاروائی، قراردادوں اور دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے الطاف علی بریلوی (۱۹۷۰)۔

۶ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۷ روایت سیّد ذکی شاہ۔ اُن کا کہنا ہے کہ اخیر عمر میں عطا محمد کو واقعی افیون کی عادت پڑ گئی تھی۔

۷ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۹۔۸۔ یہ روایت مہتاب بیگم کی ہے۔ مصنف نے غالباً اُن کی بیٹی سے سُنی ہوگی جو مصنف کی والدہ تھیں۔

۸ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۶۹۔۱۶۸ اعجاز احمد نے یہ واقعہ خود اقبال کی زبانی سنا تھا۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۹ سلطان محمود (۱۹۸۱) ص ۹۴

۱۰ شیخ گلاب دین اور میر حسن کا معاملہ جو اِس باب کی آیندہ فصلوں میں بھی آئے گا، عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۳۴۔۳۳ پر سیّد ذکی شاہ کی روایت سے ماخوذ ہے۔

۱۱ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۱۰، ۹۔ یہ روایت اُن کے والد صاحب نے اقبال کے ایک ہم جماعت کے حوالے سے سنائی تھی جس کا نام کتاب میں درج نہیں۔

۱۲ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۸۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے یہ واقعہ اقبال کی بھابی یعنی شیخ عطا محمد کی دوسری بیوی مہتاب بیگم کی زبانی سنا تھا۔ وہ مصنف کی نانی تھیں۔

۱۳ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو خود اپنے بچپن کا یہ واقعہ سنانے کا بہت شوق تھا۔ عطیہ فیضی (۱۹۴۶) اور عبدالمجید سالک (۱۹۵۵) نے الگ الگ موقعوں پر اِسے اقبال سے سن کر روایت کیا ہے۔

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۳۔ اُن کا مآخذ خوشیا کا انٹرویو ہے جو رحیم بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ میں شائع ہوا۔

۱۵ فقیر سیّد وحید الدین (۱۹۶۳) ص ۵۸۔ انہوں نے یہ واقعہ خود اقبال کی زبانی سنا تھا۔

۱۶ یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا کہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارا مآخذ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۹ ہے مگر اُنہوں نے اپنا مآخذ درج نہیں کیا۔

۱۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۵۔ اُن کا مآخذ رفیع الدین ہاشمی کی تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ہے جہاں رسالہ الزبیر، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء نمبر ۲ کے صفحہ ۱۱ پر خود محمد تقی شاہ کا بیان درج ہے۔ گیان چند نے اسے مخمس قرار دیا ہے اور یاد دلایا ہے کہ چوتھا مصرعہ پچھلے مصرعوں سے ہم قافیہ نہیں ہے۔ ممکن ہے یہی بات ہو مگر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دراصل مسدّس ہو اور محمد تقی کو مصرعے بیان کرتے ہوئے خیال نہ رہا ہو کہ وہ تیسرے مصرعے کے بعد ٹیپ کے شعر پر آ گئے ہیں (زبانی سنانے میں اِس بات کا احتمال ہے)۔ ویسے بھی اُن دنوں مسدس لکھنے کا رواج عام تھا۔ سیّد نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۵۳ پر بھی اِس کا حوالہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ”محمد اقبال نے شعر کہا: جی میں آئی جو تقی کے تو کبوتر پالے۔ کوئی کالا، کوئی اسپید ہے، دو ٹیالے۔“

۱۸ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۸)۔ دیکھیے اوپر حاشیہ نمبر ۴۔

۱۹ کسان والا واقعہ: ایضاً۔ ص ۳۴۔ اُن کا مآخذ ہے رحیم بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ میں سیّد ذکی

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

شاہ کا بیان ص ۲۶۸۔

۲۰ ایضاً

۲۱ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۳۔ یہ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی نے بیان کی ہے۔

۲۲ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۲۸۔ اُن کا ماٰخذ ہے سیارہ ڈائجسٹ، قرآن نمبر (۲) ص ۷۵۲

۲۳ نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۵۲۔ اُنہوں نے یہ روایت جمشید علی راٹھور سے سنی تھی۔

۲۴ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء۔

۲۵ اقبال بنام شاہ سلیمان پھلواری ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء

[۲۶] افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۸۔ ان کا ماٰخذ ہے اقبالنامہ حصہ اول ص ۳۴۳

۲۷ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۵۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۲۸ ایضاً ص ۱۹۹۔ روایت لالو پہلوان

۲۹ سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۸۹۔ اُن کا ماٰخذ ہے ڈاکٹر بشارت احمد کی خودنوشت یادِ رفتگاں، احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور (سنہ ندارد) حصہ اول ص ۱۴۰

۳۰

۳۱ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۳۰۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۳۲ عطا محمد کے بیٹے اعجاز احمد کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد بھی شروع شروع میں وابستہ ہوئے اور ۱۹۰۲ء تک رہے۔ اُن کے مطابق امام بی کو بھی مرزا غلام احمد سے عقیدت تھی۔

یہ بات صاف ہے کہ اقبال نے کبھی مرزا غلام احمد کی بیعت نہیں کی تھی یہاں تک کہ جب ۱۹۰۲ء میں میر حامد شاہ نے (جو ایک طرح سے اقبال کے اُستاد بھی تھے) اقبال کو دعوت دی تو اقبال نے اِس کا نہائت واضح جواب منظوم کر دیا۔ منتخب اشعار بانگِ درا میں 'عقل و دل' کے نام سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے بھتیجے اور واقفِ حال شیخ اعجاز احمد بھی جو خود نہایت سرگرم احمدی تھے، اپنی کتاب مظلوم اقبال (۱۹۸۴) میں اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک عرصے تک (بعض اصحاب کے نزدیک ۱۹۳۵ء تک) اقبال احمدیت کو پنجاب میں اسلامی معاشرے کا ایک صحت مند مظہر سمجھتے رہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اُن کے احمدیت سے اختلافات سامنے آنے لگے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ پہلے ختمِ نبوّت کے قائل نہ تھے اور بعد میں ہوئے۔ ختمِ نبوّت کا عقیدہ اُن کے ابتدائی

اشعار میں بھی پیش کیا گیا ہے مثلاً ایک نعت میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں: ''اے کہ بعد از تُو نبوّت شد بہر مفہوم شرک۔'' 'عقل و دل' والی نظم میں بھی دل کی پیروی سے یہی عقیدۂ ختمِ نبوت مراد لیا گیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اقبال وسیع النظر تھے اور عام طور پر تعصّبات سے بلند رہتے تھے۔ اُن سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی عقیدے پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے اُس عقیدے کے ماننے والوں کی اچھائیوں کو نظر انداز کر دیں گے۔

البتہ اقبال کے والدین اور بھائی کے متعلق شیخ اعجاز احمد کا دعویٰ تھا کہ اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد شروع ہی میں احمدی ہو گئے تھے اور اقبال کے والدین بھی مرزا غلام احمد سے عقیدت رکھتے تھے۔ امام بی بی نے اُن سے دعا کروائی تھی جس کے نتیجے میں عطا محمد کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور اُس کا نام اعجاز احمد بھی اسی سبب سے رکھا گیا۔ نیز یہ کہ شیخ نور محمد نے مرزا غلام احمد کی بیعت کر لی تھی جس سے وہ ۱۹۰۲ء میں دستبردار ہوئے۔ اقبال کے دیگر رشتہ داروں کو اِن روایات کے قبول کرنے میں تردّد ہے اور اِن میں خود شیخ عطا محمد کی نسل بھی شامل ہے۔ مثلاً اُن کے نواسے خالد نظیر صوفی اصرار کرتے ہیں کہ وہ احمدی نہیں تھے۔ راقم الحروف سے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ تمام روایات، یہاں تک کہ شیخ عطا محمد کی احمدیت کی روایت بھی، اعجاز احمد کے حسنِ عقیدہ کا اعجاز ہے۔ شیخ عطا محمد کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ وہ بیٹے کے لحاظ میں خاموش رہتے تھے اور اُس کے سامنے اپنے احمدی نہ ہونے پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

ایک دلچسپ روایت ملفوظاتِ اقبال میں اقبال کی زبانی بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے جب نیا نیا الہام کا دعویٰ کیا تو وہ سیالکوٹ کی مسجد میں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز اقبال بھی پہنچ گئے اور کہا کہ مجھے بھی الہام ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے سننے پر رضامندی ظاہر کی تو انہوں نے عربی میں احمدیت کے خلاف کچھ فقرے جوڑ کر پیش کر دیے جس پر وہ ساری جماعت اِن کے خلاف ہو گئی اور انہیں جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

بظاہر تو یہ شرارت اقبال کے مزاج کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے مگر اسے درست تسلیم کرنے میں قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ مرزا غلام احمد نے الہام کا دعویٰ ۱۸۸۰ء میں کیا تھا اور اگر بالفرض اقبال کی تاریخِ پیدائش ۱۸۷۳ء بھی مان لی جائے تو اُس وقت اُنکی عمر سات سال بنتی ہے۔ ۱۸۷۷ء کے لحاظ سے تو وہ صرف تین برس کے ہوئے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کا سیالکوٹ میں قیامِ الہام

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

کے دعوے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ تیسرے، اگر مرزا غلام احمد اپنے معتقدین کے ساتھ بیٹھے تھے تو اُن میں بہت سے ایسے افراد شامل رہے ہوں گے جو اقبال کے لیے بزرگوں کا درجہ رکھتے تھے مثلاً اُن کے اُستاد سیّد میر حسن کے چچازاد بھائی میر حسام الدین جن کی مسجد میں اقبال نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور حسام الدین کے بیٹے سیّد حامد شاہ جن سے ایک روایت کے مطابق اقبال نے انگریزی زبان کا پہلا سبق لیا تھا۔ اِن بزرگوں کی موجودگی میں اُس شخص کے ساتھ یوں شوخی سے پیش آنا جسے یہ حضرات اپنا رہنما مانتے تھے اور جس کی اُس وقت تک خود اقبال بھی عزت کرتے تھے (جیسا کہ اُن کے الجیلی والے مقالے سے ظاہر ہے) ایک ایسی بات ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔

۳۳

۳۴ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۳۲۔ اعجاز احمد کے بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ کس زمانے کا ہے۔

۳۵ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۲۔ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی۔

۳۶ ترجمہ ظ۔ انصاری (۱۹۸۳) سے مگر بعض جگہ لفظی ترمیم کی گئی۔ اصل فارسی اشعار یوں ہیں:

"بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند"
من نیم کز خود حکایت می کنم
از دمِ مردے روایت می کنم
از دمِ فیضے کز اُستاد آورم
خامہ را چوں نے برفیاد آورم
نالۂ نے از دمِ مردے رہست
کام ہم از ساز و ہم از راز آ گہست
بر نوائے رازِ حق گر دل نہی
بایدت چوں نے زخود بودن تہی
گر نۂ دل ریش از مستے ملاف
کیں می از اتندی بود پہلو شگاف
اے کہ از رازِ نہاں آ گہ نۂ

دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نہٗ

دست در دامانِ مردِ راہ، زن

لیک رہبر را شناس از راہزن

در ہزاراں مرد مردِ راہ یکیست

آدمی بسیار امّا شہ یکیست

۳۷ ترجمہ ظ۔ انصاری (۱۹۸۳) سے مگر بعض جگہ لفظی ترمیم کی گئی۔ اصل فارسی اشعار یوں ہیں:

در آنجا کہ از روئے فرہنگ ورائے

بجا باشد ار خود نگویند جائے

جہت را دم خودنمائی نمانند

زمان و مکاں را روائی نمانند

غبار از نظر شد ز رہ ناپدید

سراپائے بینندہ شد جملہ دید

در آورد بے کلفت سمت وسوئے

بنور السمٰوات و الارض روئے

تماشا ہلاکِ جمالِ بسیط

فروغِ نظر موجۂ زاں محیط

شنیدن شہیدِ کلامی شگرف

منزہ ز آمیزشِ صوت و حرف

کلامے بی نیرنگے ذات علم

شنیدن بہ عقل اندر اثبات علم

۳۸ نذیر نیازی (۱۹۷۹)، ص ۵۳۔ اُن کا ماخذ ہے رحیم بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ میں سیّد محمد ذکی کا بیان، 'اقبال کا بچپن' ص ۲۶۶ اور ۲۶۷۔

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

باب۴: گجرات کا قید خانہ

۱ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۷

۲ یہ تجزیہ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (۱۹۸۳) کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

۳ اقبال کی تاریخ گوئی پر محمد عبداللہ قریشی (۱۹۸۷) مفصّل ہے۔

۴ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال

۵ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۲ پر متفرق اشعار میں یہ شعر سرودِ رفتہ کے اِس نوٹ کے ساتھ درج ہے، ''اقبال کے ایک ہم وطن میرا بخش صاحب جلوہ سیالکوٹی تھے جو عرضی نویسی کرتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اقبال نے یہ شعر بطورِ تفنن اُن کے لیے کہا تھا۔ جلوہ صاحب کا رنگ خاصا سیاہ تھا جس کی وجہ سے شعر اُن پر خوب چسپاں ہوا۔''

۶ سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۴۸

۷ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۹۲

۸ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال' مطبوعہ خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء

۹ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۷۳

۱۰ اقبال کا مقالہ 'قومی زندگی' جو ۱۹۰۴ء میں ایبٹ آباد میں پڑھا گیا۔ مشمولہ: عبدالواحد، سیّد۔ محمد عبداللہ قریشی، مقالاتِ اقبال

۱۱ محمد عبداللہ چغتائی۔ ۱۹۷۷۔ ص ۲۶۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۱۲ ایضاً

۱۳ نکاح کا مفصل احوال سلطان محمود (۱۹۸۶) میں دیکھیے۔

۱۴ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال' مطبوعہ خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء

۱۵ شبلی نعمانی

۱۶ نذیر نیازی (۱۹۶۱) ص ۶۷-۶۶

۱۷ عبدالقادر، دیباچہ بانگِ درا

۱۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص

۱۹

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۲۰ گیان چند (۱۹۸۸)،ص ۵۵ اور ۵۶ پر غزل موجود ہے۔ اُنہی کا خیال ہے کہ اخلاق کسی شخص کا نام معلوم ہوتا ہے مگر زمانہ متعین کرتے ہوئے سید نذیر نیازی (۱۹۷۹)،ص ۹۵ (۱۹۸۸ء کے ص ۶۷، باب ''از دواج'') سے یہ مطلب اخذ کیا ہے،''نذیر نیازی کے مطابق اقبال ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے بیچ لاہور سے اکثر گجرات جایا کرتے تھے۔ تبھی یہ شعر کہا۔'' اِس کی بنیاد پر انہوں نے بشیر احمد ڈار کی انوارِ اقبال ص ۳۱۳ کا یہ قیاس بھی تسلیم کر لیا کہ غالباً ۱۸۹۸ء میں گجرات والا شعر پڑھا۔ بشیر احمد ڈار نے صرف قیاس کیا ہے، سند نہیں دی ہے اور سید نذیر نیازی کے بیان میں بھی سقم ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک دورانِ ملازمت میں جب بھاٹی دروازہ میں قیام تھا والدہ آفتاب اقبال ان کے ساتھ لاہور نہیں آئیں۔ سیالکوٹ ہی میں رہیں یا پھر گجرات اور گجرات سے سیالکوٹ آنا جانا رہتا۔ محمد اقبال بھی لاہور سے اکثر سیالکوٹ جاتے بلکہ گجرات بھی۔ اُسی زمانے کی ایک غزل ہے:

ہو گیا اقبال قیدی محفلِ گجرات کا
کام کرتے ہیں یہاں انسان بھی صیاد کا''

سید نذیر نیازی نے شعر کا دوسرا مصرع غلط لکھا ہے اگرچہ حوالہ روزگارِ فقیر حصہ دوم کا دیا ہے (مگر صفحہ نمبر کے بغیر) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یادداشت اور اندازے سے لکھ رہے تھے۔ نیز ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء اقبال کا زمانہ ملازمت نہیں بلکہ زمانہ تعلیم تھا جس کے لیے وہ لاہور میں رہتے تھے۔ ملازمت بعد میں شروع ہوئی۔ نذیر نیازی نے بظاہر غزل کا زمانہ بھی اندازے ہی سے متعین کیا ہے مگر یہ بات نظر انداز کر گئے ہیں کہ اقبال شادی کے پہلے دو برسوں میں بھی سسرال جاتے تھے اور محفلِ گجرات کا قیدی ہونا اُس زمانے پر زیادہ صادق آتا ہے نہ کہ بعد کے زمانے میں جب لاہور جا بسے تھے۔ بہرحال بشیر احمد، نذیر نیازی اور گیان چند میں سے کسی نے غزل پر خصوصی توجہ دے کر یہ نہیں دیکھا کہ اِتنی ناپختہ غزل قیامِ لاہور کے زمانے کی نہیں ہو سکتی جب مرزا ارشدؔ سے داد مل رہی تھی۔ پھر اِس غزل کا قافیہ ردیف بھی نومبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہونے والی غزل سے مشترک ہے۔

۲۱ اعجاز احمد (۱۹۸۴)ص ۱۸۶-۱۸۵۔ یہ چونکہ گیان چند کی مرتبہ ابتدائی کلامِ اقبال میں بھی شامل نہیں لہٰذا یہاں پوری درج کی جا رہی ہے۔ عنوان تھا،''مشہور پنجابی مثل ہے جیہا منہ تئی چپیڑ'':

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
مہتروں میں خوب ہو گی قدر دانی آپ کی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

بیت ساری آپ کی بیت الخلا سے کم نہیں
ہے پسندِ خاکروباں شعر خوانی آپ کی
تیلیاں جاروب کی لیتے وہ خامہ کے عوض
کھینچتے تصویر گر بہزاد و مانی آپ کی
راہ اپنی چھوڑ کر نکلے دہن کی راہ سے
ہے مگر بادِ مخالف نغمہ خوانی آپ کی
ان دنوں کو فصلِ گل کہیئے و یا دن پھول کے
ہر طرف ہوتی ہے سعدی گل فشانی آپ کی
آپ کے اشعار موتی ہیں مگر تی کے بغیر
گوشِ عالم تک یہ پہنچے ہیں زبانی آپ کی
گوہرِ بے آرا جھڑے ہیں آپ کے منہ سے سبھی
جان سے تنگ آ گئی ہے مہترانی آپ کی
ہر طرف سے آ رہی ہے یوں جو دُر دُر کی صدا
بھا گئی اہلِ سخن کو دُرفشانی آپ کی
آپ سے بڑھ کر عروضے کوئی دنیا میں نہیں
واہ صاحب شعرخوانی شعردانی آپ کی
خاک کو ہم چاٹ کر یہ بات کہہ دیتے ہیں آج
تلخ کامی ہو گی یہ شیریں دہانی آپ کی
جب اُدھر سے بھی پڑیں گے آپ کو سابن کے مول
آپ پر کھل جائے گی رنگیں بیانی آپ کی
کھاؤ گے فرمائشی سر پلپلا ہو جائے گا
پھر نکل جائے گی سر سے شعرخوانی آپ کی
دین اور ایمان کی دُم میں واہ نمدہ دے دیا
سارے عالم کی زباں پر ہے کہانی آپ کی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

آفتابِ صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں
حضرتِ شیطاں کریں گے سائبانی آپ کی
اشتہارِ آخری اِک آنت ہے شیطان کی
سر بسر جن سے عیاں ہے خوش بیانی آپ کی
وہ مثل ہے، ہے طویلے کی بلا بندر کے سر
ہو گیا ہم کو یقیں شامت ہے آنی آپ کی
خر گھماروں کا موا ستی ہوتی ہے مفت
ہے مگر قومِ نصاریٰ یارِ جانی آپ کی
رانڈ کے چرخے کی صورت کیوں چلے جاتے ہیں آپ
اہلِ عالم نے سبھی بکواس جانی آپ کی
نیلے پیلے یوں نہ ہو پھر کیا کرو گے اُس گھڑی
جب خبر لیوے گا قہرِ آسمانی آپ کی
بات رہ جاتی ہے دنیا میں نہیں رہتا ہے وقت
آپ کو نادم کرے گی بدزبانی آپ کی
قومِ عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل
واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

۲۲ ایضاً ص ۳۷

۲۳ ایضاً ص ۹۸

۲۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ان کا ماخذ ہے اقبال کی اپنی روایت منقولہ در رسالہ جوہر (دہلی) ۱۹۳۸ء

۲۵ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۲۲

۲۶ اقبال نے یہ واقعہ مثنوی اسرار و رموز کے حصے 'رموزِ بیخودی' میں نظم کیا ہے۔

۲۷

۲۸ جیلانی کامران (۱۹۷۷) ص ۱۷-۱۶

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

باب ۵: حکیموں کا بازار

۱ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص ۲۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۲ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۴۲

۳ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۲۶، ۲۷۔ اعجاز احمد نے مقدمے کی تاریخ نہیں دی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور یہی زمانہ رہا ہوگا۔

۴ اِس غزل کے بارہ اشعار دستیاب ہیں جو گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۶-۱۱۵ پر موجود ہیں۔ اِس کا قدیم ترین ماخذ فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) ہے چنانچہ اِس کا زمانہ معلوم نہیں ہوسکا مگر یہ داغ کی زندگی میں لکھی گئی ہوگی کیونکہ اِس کا مقطع ہے:

جنابِ داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

گیان چند نے اِسے مخزن کے زمانے کی غزلوں کے درمیان رکھ دیا ہے مگر میرے خیال میں یہ بہت پہلے کی ہے کیونکہ نظمیں لکھنا شروع کرنے کے بعد یا اُس سے بھی پہلے اقبال نے داغ سے اصلاح لینا چھوڑ دی تھی جبکہ یہ غزل داغ کی شاگردی کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہاں واعظ پر پھبتیوں میں کچا پن ہے مثلاً:

پتے کی کہہ رہا ہوں یاد ہوگی تجھ کو اے واعظ!
وہ خلوت اور اُس خلوت میں پھر آں کارِ دیگر بھی

۵ Muhammad Siddique

۶ غلام بھیک نیرنگ، میر (۱۹۵۹) ص ۲

۷ غزل روزگارِ فقیر کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۴۵ پر موجود ہے۔ نیرنگ کا بیان مجلّہ اقبال، اکتوبر ۱۹۵۷، ص ۴ پر اُن کے مضمون 'اقبال کے بعض حالات' سے ماخوذ ہے۔

۸ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۶۸

۹ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۵۱

۱۰ مشاعرے کی تاریخ کے بارے میں عرصہ تک اختلاف رہا ہے کہ یہ ۱۸۹۵ء میں منعقد ہوا یا ۱۸۹۶ء

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میں۔ ناظم اقبال اکادمی پاکستان جناب محمد سہیل عمر نے تصدیق کی ہے کہ ایک لائبریری میں رسالہ شورِ محشر کا دسمبر ۱۸۹۵ء کا پرچہ دیکھا گیا ہے جس میں مشاعرے کی تاریخ دسمبر ۱۸۹۵ء درج ہے۔

۱۱ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء۔

۱۲ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)

۱۳ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۱۳۶

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)

۱۵ اعجاز احمد (۱۹۸۵)

۱۶ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۹۹۔ روائت لالو پہلوان

۱۷ معراج بیگم کا تذکرہ اقبال کی اکثر سوانح میں پایا جاتا ہے۔

۱۸ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۱۳۹

۱۹ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۵۱

۲۰ ایضاً

۲۱ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷)۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۲۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۴۴ پر اعداد کا حل تفصیلاً موجود ہے مگر قطعے میں اشعار کی تعداد کا گم شدہ اعداد کے ساتھ نظر انداز ہوا ہے۔

۲۳ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۷۰

۲۴ پوری غزل، نسیم اور تشنہ کا تعارف نیز دیگر تفصیلات گیان چند (۱۹۸۸) ص ۴۶ تا ۴۹ پر موجود ہیں۔

۲۵ دیکھیے عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت احمد حسین خان

۲۶ اِس کا صحیح زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۵۳ اور ۵۴ میں اِسے مرزا ارشؔد والے مشاعروں کے زمانے میں رکھا گیا ہے۔ وہاں رافؔت کا تعارف بھی موجود ہے اور خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ جب رافؔت لاہور آ کر کچھ عرصہ پیسہ اخبار میں سب اڈیٹر ہوئے یہ غزل شاید اُس زمانے میں کہی گئی ہو اگرچہ رافؔت کے لاہور آنے کا زمانہ ٹھیک سے معلوم نہیں۔ اُس زمانے کے اخبارات میں دیکھنے کی ضرورت

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ہے۔

۲۷ پوری غزل گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۸ پر موجود ہے۔ شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اقبال سے اُن کی پہلی ملاقات جس مشاعرے میں ہوئی وہاں اقبال نے یہی غزل پڑھی تھی۔

۲۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۴ اور ۵۵ پر یہ غزل روزگارِ فقیر کے حوالے سے درج کی گئی ہے جس میں اس کا ماخذ شیخ اعجاز احمد کی بیاض ہے۔ اِس کا زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند کے نزدیک ''اشعار کے قدیم اور ناپختہ رنگ کی بنا پر یہ بھی ۱۸۹۷ء کے بعد کی نہیں ہوسکتی''۔

۲۹ اقبال پر طوائف کے قتل کے الزام کے سلسلے میں مفصل بحث کے لیے دیکھیے جاوید اقبال (۱۹۸۱) ص ۱۸۰

۳۰ گیان چند (۱۹۸۸ء) ص ۵۹ پر یہ غزل موجود ہے۔ مقطع سے پہلے کے شعر کا پہلا مصرع موجود نہیں جس کی وجہ سے اُن کا اندازہ ہے کہ یہ مصرعِ طرح ہوسکتا ہے ''جس پر گرہ لگانے کا ارادہ ہو لیکن لگائی نہ گئی۔''

۳۱ یہ تینوں نظمیں گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۸-۸۳ پر موجود ہیں۔ 'عیشِ جوانی' ۱۴۵ اشعار کا قطعہ ہے جس میں شاعر نے گزری ہوئی جوانی کو یاد کرتے ہوئے وصال کے لمحات کا نقشہ کھینچا ہے اور ''بوس و کنار'' کے قافیے کو اتنی بار استعمال کیا ہے کہ بیزاری ہونے لگتی ہے۔ آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اب بوڑھا ہو چکا ہے اور ناتوانی سے کروٹ بدلنا بھی ناگوار ہے۔ اس کے بارے میں خود گیان چند نے خیال ظاہر کیا ہے، ''اقبال سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے... لیکن 'در ایامِ جوانی چناں کہ اُفتد دانی' والا معاملہ ہے۔'' اُنھوں نے کسی سَند کے بغیر اسے اقبال کی نظم تین بنیادوں پر مان لیا ہے۔ پہلی یہ کہ اقبال نے ایک اور متروک قطعے 'ہم نچوڑیں گے دامن' میں بھی عورت کے سراپے کی تصویرکشی کی ہے۔ یہ موقف تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اقبال کی شاعری میں بھی جنس کا اثر جھلکا ہوگا اور ایسی کوئی چیز ملے تو اُسے تبرک سمجھا جائے مگر ایسی چیز 'ہم نچوڑیں گے دامن' تو ضرور ہے کیونکہ اُس میں ذہانت جھلکتی ہے، 'عیشِ جوانی' صرف جنس زدہ ہی نہیں بلکہ اس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچنے کے لیے جس قدر بے لطف انداز اختیار کیا گیا ہے وہ اقبال کے فطری رجحانات سے کسی زمانے میں بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ گیان چند کی دوسری دلیل یہ ہے، ''عام طور سے قطعے میں مطلع نہیں ہوتا لیکن اقبال نے اپنی کئی نظموں میں ایسا کیا ہے مثلاً 'شمعِ زندگانی' میں۔ یہی ہئیت دوسری نظم 'گلِ خزاں دیدہ' کی ہے۔'' یہ

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

دلیل کافی نہیں ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جن دو نظموں کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے یعنی 'شمعِ زندگانی' اور 'گلِ خزاں دیدہ' خود اُن دونوں کے اقبال کی نظمیں ہونے کی سند نہیں ہے۔ تیسری دلیل ہے، ''آخری شعر میں 'خندۂ گل' کا موضوع بھی اقبال پن لیے ہوئے ہے'' مگر بلبل کے کاروبار پر خندہ ہائے گل تو غالب کے یہاں کے بھی ہیں۔

اِس نظم کا قدیم ترین ماخذ جو مولف کو بالواسطہ دستیاب ہوا وہ نیچرل شاعری ہے جو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان کسی وقت لکھنو سے شائع ہوئی۔ اس کے مرتب صفدر مرزا پوری کی بے توجہی کا اندازہ گیان چند کی اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے، ''اِس میں ڈاکٹر اقبال ایم اے اور مسٹر اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا کے نام سے حسبِ ذیل نظمیں شامل ہیں...'' گویا کتاب میں ایک ہی شاعر کا نام الگ الگ جگہوں پر الگ الگ اعزازات کے ساتھ درج ہے اور لطف یہ ہے کہ دونوں جگہ غلط یعنی ''ڈاکٹر اقبال ایم اے'' جبکہ کسی نے صرف ایم اے کیا ہو تو وہ ڈاکٹر کیسے کہلائے گا اور ''مسٹر اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا'' تاریخی اعتبار سے غلط کیونکہ اقبال بیرسٹر بننے سے پہلے پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ جس مرتب کی بے توجہی کا یہ حال ہو اُس کی سَنَد پر ایک بالکل نئی نظم کو اقبال سے کیونکر منسوب کر لیا جائے۔

دوسری نظم 'گلِ خزاں دیدہ' میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ایک پھول کی زبان سے کھینچا گیا ہے جو کبھی جوان تھا اور اَب نہیں ہے۔ بظاہر یہ نظم اُسی شاعر نے لکھی ہوگی جس نے 'عیشِ جوانی' لکھی تھی اور کسی سند کے بغیر اِس شاعر کو اقبال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظم بھی صفدر مرزا پوری کے مجموعے نیچرل شاعری سے لی گئی ہے جہاں اِس کا ماخذ درج نہیں کیا گیا۔

تیسری نظم 'شمعِ زندگانی' کے بارے میں گیان چند خود لکھتے ہیں، ''یہ نظم محض باقیات [یعنی باقیاتِ اقبال] طبع سوم میں ص ۲۲۹ م ۲۲۸ پر ہے۔ مرتب نے اس کا ماخذ نہیں دیا تاکہ اقبال سے اس کے انتساب کے بارے میں مزید یقین ہو جاتا۔ ویسے شمع سے خطاب کرنا اقبال کو بہت مرغوب ہے۔ اس نظم میں شاعر موت آنے پر گڑگڑا کر کہہ رہا ہے کہ چندے اور دُنیا میں رہنے دے۔ یہ خیال اقبال کے مسلک کے بالکل برعکس ہے۔ نظم کا زمانہ معلوم نہیں لیکن اس کی ذہنی افتاد کے پیشِ نظر یہ ابتدائی دَور ہی کی ہو سکتی ہے۔'' میرے خیال میں یہ اقبال کے کسی دَور کی بھی نہیں ہو سکتی اور شمع سے خطاب کرنا اقبال ہی کو نہیں اکثر شعرا کو مرغوب تھا مگر جس نوعیت کا یہ خطاب ہے وہ اقبال سے بعید ہے۔ ویسے اِس میں خطاب شمع سے نہیں بلکہ 'شمعِ زندگانی' سے ہے اور اقبال نے زندگی کو عموماً شمع نہیں بلکہ شرار یا شعلے سے

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تشبیہ دی ہے۔ ان دونوں باتوں میں لطیف فرق ہے۔ گیان چند نے اسماعیل میرٹھی کی نظم 'شمعِ ہستی' کو بھی اقبال کی سمجھ لیا اور شائد اِسی وجہ سے تامل کے باوجود اِس نظم کے بارے میں بھی باقیاتِ اقبال کا دعویٰ تسلیم کر بیٹھے۔

۳۲ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص ۲۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۳۳ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۷-۵۶ پر اِس کے رنگ کی وجہ سے اِسے لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں رکھا گیا ہے۔

۳۴ اِس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۷ پر اِسے اس کے رنگ کی بنا پر لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں رکھا گیا ہے۔

۳۵ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۱-۴۹

۳۶ عبداللہ قریشی (۱۹۷۷) ص ۵۴ روایت جمشید راٹھور

۳۷ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۸۱۔ روایت پروفیسر منظور احمد (اقبال کے بھانجے)

۳۸ Muhammad Siddique

۳۹ سلطان محمود حسین (۱۹۸۱) ص ۷۶

۴۰ Muhammad Siddique

۴۱ Javid Iqbal, ed. (1962/2006)

۴۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۳-۵۱۔ بعض مصنفین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مردِ مومن اور خودی والے اشعار اقبال نے ۱۹۱۵ء کے بعد اضافہ کیے ہوں گے۔ بظاہر اِس قیاس آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ دونوں الفاظ یہاں اُن معانی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں جو ۱۹۱۵ء کے بعد اقبال نے اِن الفاظ کو پہنائے تھے۔ یہاں تو خودی والے شعر میں بھی حسینوں سے چھیڑ چھاڑ ہی نظر آتی ہے۔ مردِ مومن کے تبسم والی بات تصوّف کا ایک روائتی نظریہ ہے جسے بعد میں اقبال نے فارسی میں دوبارہ نظم کر کے اور زیادہ مشہور کر دیا۔ غزل کا کوئی اوّلین نسخہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ شبہات پیدا ہوئے۔

۴۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۴۴۔

۴۴ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۱ پر متفرق اشعار میں درج ہے۔ مولف کا خیال ہے کہ یہ ابتدائے عمر کا ہوگا

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

کیونکہ اِس میں بھی نام پر اُسی قسم کا فخر جھلکتا ہے جیسا اُس مشہور واقعے میں جب اقبال نے دیر سے اسکول پہنچنے پر کہا تھا کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔ میرے خیال میں ضروری نہیں کہ اِسے بالکل ہی اسکول کے زمانے کا شعر سمجھا جائے البتہ طالب علمی کے کسی بھی دَور کا اور انجمن حمایتِ اسلام سے پہلے کا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ البتہ باقیات اقبال کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸) ص۸۲ پر ایک شعر درج ہے:

رومال کے لباس میں ابر آ کے بارہا
پانی پیا کیا مری چشمِ زلال سے

غالباً یہ شعر اقبال کا نہیں کیونکہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء ص۵۶ پر 'کچکول' کے تحت بلاعنوان شائع ہوا ہے۔ پسند کرنے والے کا نام عبدالغفور پوپلزئی تھا۔ پچھلے اشعار امیرؔ مینائی کے تھے۔ ممکن ہے غلطی سے یہ شعر باقیاتِ اقبال کے مرتب نے شامل کر لیا ہو۔ اس کے علاوہ مخزن میں دوسرا مصرع یوں ہے:

پانی پیا کیا مری چشمِ پُرآب سے

۴۵ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص۴۲۔ روایت ذکی شاہ

۴۶ آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش متعدد کتابوں میں درج ہے۔

۴۷ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص۱۳۶

۴۸ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷)۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۴۹ ایضاً

۵۰ امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) ص۲۵۱ پر غلام رسول مہر کی ڈائری کے اقتباسات میں ۲۴ جولائی ۲۵ کو اقبال کی کسی گفتگو کے حوالے سے یہ نوٹ درج ہے: ''پہلے ایک تغیر ہوا تھا جس کی تاریخ ایم اے کے زمانے سے شروع ہوئی ہے۔ یہ دماغی دہریت تھی جو ولایت میں جا کر اوجِ کمال تک پہنچی۔ ولایت کے بعد اس میں ردِعمل۔'' یہ ۱۸۹۸ سے ۱۹۰۸ کا زمانہ بنتا ہے۔ اس عرصے میں اقبال کے یہاں کسی دماغی دہریت کے شواہد نہیں ملتے مگر مابعدالطبعیات کے ساتھ ان کا شغف اِسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے جس کا اوجِ کمال پی ایچ ڈی کا مقالہ ایران میں مابعدالطبعیات کا ارتقا تھا۔ یہ جون ۱۹۰۸ء یعنی ان کے قیامِ یورپ کے بالکل آخری دنوں میں لندن سے شائع ہوا۔ محمد دین کی تاثیر (ممتاز گوہر مرزا،

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ص ۶۷-۶۳) کے مطابق اسی زمانے میں اقبال کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خلفائے راشدین کے بعد اسلام کی اصل روح کے زوال کے اسباب کیا تھے اور کافی تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کا یونانی فلسفے کی طرف متوجہ ہونا ہی زوال کا اصل سبب تھا۔ یورپ سے واپسی کے دو برس بعد انہوں نے اپنی نوٹ بک میں درج کیا، ''میں مابعدالطبعیات سے بیزار ہوتا جارہا ہوں...'' (انگریزی جاوید اقبال ۲۰۰۶ ص ۳۲)۔ بعد میں اُنہوں نے اور بھی کھل کر یہ بات کہی:

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات

۵۱ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۲۷

۵۲ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۲۸

۵۳ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۷۸

۵۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۹۷۔ روایت خواجہ فیروزالدین بیرسٹر

۵۵ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال' مطبوعہ خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء

۵۶ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۵۷

۵۷ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۱۰۹

۵۸ حسن اختر (۱۹۸۸) اور دوسرے

۵۹ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۷، روایت ذکی شاہ۔ انہوں نے ۱۸۹۵ء بتایا ہے جو یادداشت کی غلطی ہے۔ لاہور میں اجلاس ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔

۶۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۶۱-۶۰ پر غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر ۱۹۰۰ء سے پہلے کلام میں رکھی ہے کیونکہ غزل کی ردیف ''گویا'' کئی اشعار میں بالکل حشو ہے، مثلاً:

بے حجابی بھی ہے تو ایسی ہے
جس میں پردے کی شان ہے گویا

گیان چند کا خیال ہے کہ ''یہ زمیں آسمان ہے گویا'' مصرعِ طرح ہوسکتا ہے۔ انہوں نے بشیر الحق دیسنوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ پہلا شعر جون ۱۹۰۷ء میں گلدستہ اصلاحِ سخن کے پہلے شمارے میں مدیر کے اِس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا کہ اقبال نے ایک مختصر سے غزل انہیں لاہور میں سنائی تھی جس کا

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ مجھے مدیر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۶۱ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۷۔ روایت ذکی شاہ

۶۲ گیان چند (۱۹۸۸ء) ص ۶۰ پر پوری غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر انہوں نے ''اِس کے رنگ اور روزگار میں اِس کے وقوع کی بنا پر'' اِسے طالب علمی کے اخیر زمانے میں جگہ دی ہے۔ میں نے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

باب ۶: مشرقی کالج کا استاد

۱ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۷

۲ ایضاً

۳ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۶۱

۴ ایضاً ص ۹۹

۵ ایضاً

۶ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۶۲

۷ متعدد، خصوصاً عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۹۷۔ روایت علی بخش

۸ وحید الدین، فقیر سید (۱۹۵۰) ص ۱۰۰۔ اقبال کے ستار بجانے کے متعلق ایک روایت بعض دفعہ بیان کی جاتی ہے جس میں ایک سکھ دوست کے ساتھ پنجابی میں ذومعنی جملوں کا تبادلہ مثلاً سکھنی چاہیے اور سکھ دا ہے وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ دراصل کوئی عام لطیفہ معلوم ہوتا ہے جس میں کسی نے اقبال کا نام مخواہ ڈال دیا ہے کیونکہ اس روایت کے مطابق جب اقبال ستار بجانا سیکھ رہے تھے تو جاوید اقبال بھی موجود تھے جنہیں سکھ دوست نے مذاق میں شامل کر لیا۔ جاوید اقبال ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور اُس زمانے میں اقبال ستار بجانا نہیں سیکھ رہے تھے بلکہ بجانا بھی ترک کر چکے تھے۔

۹ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۰ پر غزل موجود ہے۔ گیان چند نے اندازے سے اس زمانے میں رکھا ہے اور میں نے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

۱۰ سوامی رام تیرتھ کے حالات کے لیے دیکھیے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۰۴ اور افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۷

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۱۱ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲۔

۱۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۱ پر پوری غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند نے اندازے سے اس زمانے میں رکھا ہے اور میں نے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

۱۳ اعجاز احمد کا بیان جس کی خاندان کے باقی افراد تردید کرتے ہیں یہ ہے کہ اُن کے والد عطا محمد اُس وقت تک احمدی ہو چکے تھے۔ اُن کے یہاں کوئی لڑکا نہ ہوتا تھا۔ اُنہوں نے مرزا صاحب سے دُعا کروائی جس کے نتیجے میں لڑکا ہوا اور اسی لیے اُس کا نام اعجاز احمد رکھا گیا۔ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۸۶ وغیرہ

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۶

۱۵ حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۶

۱۶ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۵۸-۵۷ پر اِسے اس کے رنگ کی بنا پر اِس زمانے میں رکھا گیا ہے اور میں نے مقطع کو موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

۱۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۰ پر پوری غزل موجود ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں مگر مولف اس کے رنگ کی بنا پر اِسے اس زمانے میں رکھا ہے۔

۱۸ حسن اختر، ڈاکٹر ملک (۱۹۸۸) ص ۴۰

۱۹ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲۔

۲۰ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۴

۲۱ جاوید اقبال (۱۹۷۹) ص ۹۸

۲۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۶۹-۶۱ پر نظم موجود ہے اور جلسے کی کیفیت وغیرہ بھی۔

۲۳ یہ گوپی چند نارنگ کے معروضات ہیں۔ دیکھئے ان کا مضمون 'اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام' مشمولہ بشیر فاروق (۱۹۹۳) ص ۵۱

۲۴ حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۲ بحوالہ سالانہ رپورٹ اورینٹل کالج ۱۹۰۰ء

۲۵ مقالے کا بہت سا حصہ اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے *The Development of Metaphysics in Persia* میں شامل ہوا۔

۲۶ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۶۹-۷۳ پر نظم موجود ہے۔ مولف نے رائے ظاہر کی ہے، ''حیرت ہے کہ اقبال جیسے شاعر کو اِتنا حجاب کیوں تھا کہ خاص موقع کے لیے لکھی ہوئی نظم جلسے میں نہ سنا سکے، بالخصوص

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اس صورت میں جب کہ ایک اور شاعر نے نظم سنائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ احمد حسین خاں کی نظم شاعرانہ اعتبار سے بہتر تھی جس کی وجہ سے اقبال نے اُس وقت اپنی نظم کو پی جانا مناسب سمجھا ہو[؟]''

۲۷ B.A. Dar (1967), p.36

۲۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۷۶ پر غزل کے تین اشعار اور یہ مصرع درج ہے جس کی چستی کی وجہ سے گیان چند کا خیال ہے کہ یہ کسی مشاعرے کا مصرعِ طرح ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند نے اندازے سے اِسے اس زمانے میں رکھا ہے۔

۲۹ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۰-۷۹ پر غزل موجود ہے۔ چار اشعار ہی دستیاب ہوئے ہیں اور زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند نے اندازے سے اس زمانے میں رکھی ہے اور عبداللہ قریشی کی معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۳۰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبداللہ قریشی کے بموجب مقطع شاید اُس زمانے کا ہے جب داغؔ نے اپنے شعر میں اُردو پر اجارہ داری کا دعویٰ کیا تھا۔

۳۰ حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۲

۳۱ گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۷۹-۷۷ پر قطعاتِ تاریخ موجود ہیں۔

۳۲ عبداللہ قریشی (۱۹۸۷) ص ۳۵

۳۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)

۳۴ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں اس نظم کا اولین متن بانگِ درا ہی میں دستیاب ہے جہاں اقبال نے اسے پہلے حصے یعنی ۱۹۰۵ء تک کی نظموں میں رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ درسی کتابوں کے لیے جس زمانے میں 'ہمدردی' وغیرہ لکھی تھیں اُسی زمانے میں اقبال نے یہ نظم بھی لکھی ہو۔ مجھے اس بارے میں بھی کوئی شواہد نہیں مل سکے ہیں کہ بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے یہ نظم کتنی مقبول تھی لیکن عام تاثر یہی ملتا ہے کہ اسکولوں میں یہ نظم گانے کا رواج شائد اُس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

۳۵ یہ رائے پروفیسر کرار حسین صاحب نے اپنی ایک تقریر میں پیش فرمائی۔

باب ۷: ہمالہ

۱ حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۵۹

۲ فقیر سید وحیدالدین (۱۹۶۳) ص ۱۲۶

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۰۵

۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۶۳

۵ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۸

۶ 'ہمالہ' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۹-۱۰۶ پر موجود ہے۔ مولف کو مخزن کا شمارہ دستیاب نہ تھا لہٰذا رختِ سفر میں سے اولین متن کو تلاش کیا اور اُس کا موازنہ بعض دوسرے متون کے ساتھ کیا۔ چونکہ اِن دوسرے متون کا ماخذ بھی صرف مخزن ہی ہوسکتا تھا لہٰذا میرے خیال میں صرف مخزن کے متن کو نظم کی پہلی صورت جان کر اُس کا موازنہ بانگِ درا کے نظرِ ثانی شدہ متن سے کرنا چاہیے۔ باقی متون نظر انداز کیے جاسکتے ہیں کیونکہ ان میں جو فرق ہیں وہ اختلافِ نسخ نہیں بلکہ نقل کی اغلاط ہیں۔

میں نے مخزن کا شمارہ دیکھا ہے۔ بانگِ درا سے اس کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا ترتیب دیتے ہوئے اقبال نے نظم میں تین طرح کی تبدیلیاں کیں:

i بعض مصرعوں کی جگہ اُن سے بہتر مصرعے رکھ دیے۔ مثلاً "کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی" کی جگہ "کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی" رکھ دیا جس سے کوثر و تسنیم کا مقام بھی بلند ہوگیا اور اسی اعتبار سے ندّی اور خود شاعر کا بھی۔

ii بعض مصرعوں میں لفظی ردّ و بدل کر کے انہیں بہتر بنا دیا۔

iii بعض بند نکال دیے مثلاً بدھ مذہب والے بند نکالنے کی وجہ نظریاتی نہ تھی کیونکہ بدھ مذہب کا تذکرہ دوسری جگہوں پر اور بعد کی شاعری میں بڑی آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ 'ہمالہ' بانگِ درا کی پہلی نظم بننے جا رہی تھی، شائد اس لیے بھی اِس میں کسی مخصوص مذہب کا ذکر کرنے کی بجائے صرف آغازِ جستجو کی کیفیت دکھانی مقصود ہوگئی تھی۔ اِس سے نظم کی وحدت بھی زیادہ نمایاں ہوگئی۔

ذیل میں بانگِ درا والا متن نقل کیا جا رہا ہے تاکہ موازنہ کیا جاسکے:

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تو جواں ہے گردش شام وسحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے
امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندستاں ہے تو
مطلع اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالمتاب پر
تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامن موج ہوا جس کے لیے رومال ہے
ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برق سر کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشہ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

دست گل چیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلی شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

۷ 'مزدور کا خواب' نامکمل متروک نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۹-۲۳۸ پر فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) سے شامل کی گئی ہے۔ اِس کا زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند نے اندازاً اِسے یورپ سے قبل کی نظموں میں ۱۹۰۴ء کے زمانے میں رکھا ہے۔ مجھے یہ اُس سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔ بعد

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

میں اقبال نے اِس ہئیت کے تجربے 'حسن و عشق' (۱۹۰۷) اور 'ابی سینیا' (۱۹۳۶) وغیرہ میں کیے۔

۸ دیکھیے حاشیہ ۱۱

۹ 'طلوعِ اسلام' اور 'مسجدِ قرطبہ' کے ہر بند میں آٹھ آٹھ شعر ہیں بلکہ 'مسجدِ قرطبہ' میں تو بند بھی آٹھ ہیں (باربرا مٹکاف نے ایک مقالے میں اِس نظم کی ساخت اور فنِ تعمیر کے درمیان موازنہ کر کے اِس قسم کے پہلوؤں کی افادیت واضح کی ہے)۔ 'ذوق وشوق' کے ہر بند میں چھ اشعار ہیں اگرچہ اصل مسودے میں اِس سے کہیں زیادہ اشعار تھے جن کی قطع و برید کے بعد اقبال نے ہر بند کے لیے صرف چھ شعر منتخب کیے۔ اِس کے برعکس بعض ترکیب بند نظموں میں یہ چیز پیشِ نظر نہیں رکھی، مثلاً 'شمع و شاعر' اور 'خضرِ راہ' کے بند چھوٹے بڑے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اتفاقاً نہیں بلکہ عمداً ہے ورنہ اگر 'ذوق وشوق' کے مسودے میں سے نصف کے قریب اشعار خارج کر کے نظم کو ایک خاص ساخت کا پابند کر سکتے تھے تو 'شمع و شاعر' میں سے بھی اشعار خارج کیے جا سکتے تھے (اور ترمیم تو اُس میں بھی کی بھی گئی)۔

۱۰ Tony Rennel (2000/2001), *The Last Days of Glory*, p.1

۱۱ 'اشکِ خوں (یعنی ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ)' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۹۵-۸۹ پر نظم موجود ہے۔ جس تعزیتی جلسے میں یہ نظم پڑھی گئی مولف نے اُس کی تاریخ غلام رسول مہر کے قیاس کے حوالے سے ۲۳ یا ۲۴ جنوری تسلیم کر کے رائے دی ہے، "اُس میں اقبال نے اِتنا طویل مرثیہ پڑھا۔ دو ایک دن میں ۱۱۰ اشعار کی نظم لکھ دینا اُن کی زُود گوئی اور پُر گوئی کی دلیل ہے۔" اقبال کی زُود گوئی کی اور مثالیں بھی موجود ہیں مگر یہ بات یقینی نہیں ہے کہ جلسے میں پورا مرثیہ پڑھا گیا اور اشاعت کے وقت کچھ اضافہ نہیں کیا گیا۔

۱۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۹۴

۱۳

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۵

۱۵ 'پنجہ فولاد' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۶-۱۰۴ پر موجود ہے۔ کسریٰ منہاس کے مضمون 'مورخینِ لاہور' نقوش لاہور فروری ۱۹۶۲ء ص ۹۹۹-۹۹۸ کے حوالے سے داغؔ کا لکھا ہوا قطعہ بھی درج ہے جس سے ۱۳۱۹ھ تاریخ نکلتی ہے:

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

خریدارو نیا اخبار دیکھو
سنا دو مصرعِ تاریخ اے داغ
یہ لو اخبارِ جوہردار دیکھو

۱۶ ڈاکٹر اجمل خان نیازی (۱۹۹۰)، ص۵۶

۱۷ عبدالقادر نے یہ واقعہ بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

۱۸ عبدالقادر نے یہ واقعہ بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

۱۹ عبدالقادر نے یہ بات بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کی ہے۔

۲۰ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲۔

۲۱ مکتوب بنام کشن پرشاد

۲۲ اِس غزل کے سترہ اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۱۲-۱۱۱ پر موجود ہیں۔

۲۳ گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۱۵-۱۱۳ پر اِس غزل کے سولہ اشعار موجود ہیں جو مختلف مجموعوں سے حاصل کیے گئے ہیں مگر مخزن جولائی ۱۹۰۱ء کا شمارہ گیان چند کی نظر سے نہیں گزرا۔ جن اشعار کو اقبال نے مخزن میں شائع نہ کروایا اُن میں تین مقطعے موجود ہیں جن میں سے آخری اور بے تکا مقطع جگن ناتھ آزاد کے مطابق مولانا صلاح الدین اور شورش کاشمیری کی بیاضوں میں تھا جس کے لیے مولف نے آزاد کے مضمون 'داغ کے اثرات اقبال پر' مشمولہ اقبالیات لاہور جولائی ستمبر ۱۹۸۶ء ص۲۷ کا حوالہ دیا ہے:

نئی ہو پرانی ہو اقبال کو کیا
یہ حضرت تو بس ایک پی جانتے ہیں

یہ شعر اقبال کا ہو تب بھی امکان نہیں کہ ۱۹۰۱ء میں یا اُس کے بعد شائع کروایا ہو۔ معلوم نہیں اِن بیاضوں میں کہاں سے آیا۔

۲۴ گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۱۵ پر اِس غزل کے سات اشعار موجود ہیں جو روزگارِ فقیر سے لیے گئے ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند نے اِس کے رنگ کی وجہ سے اِسے یہاں جگہ دی ہوگی۔ "رموزِ اتحادِ حسن و عشق"، میں خودی اور بیخودی کی اُس وحدت کے بیج موجود ہیں جسے بعد میں اقبال نے ایک باقاعدہ حکمت کے طور پر بیان کیا۔ حکمت بعد میں پیدا ہوئی مگر اُس کی جذباتی اَساس یہاں موجود

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ہے۔ آگے چل کر معانی نہیں بدلے بلکہ الفاظ بدل گئے۔

۲۵ ’گل رنگیں‘ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۱-۱۰۹ پر موجود ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ مخزن مئی ۱۹۰۱ء کا شمارہ مولف کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ گل رنگیں وہی علامت ہے جو ترقی کر کے لالہ بن گئی۔ یہ علامت بعض ابتدائی غزلوں میں بھی موجود تھی مثلاً گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۶ پر نقل کیے ہوئے اس شعر میں:

بادہ کش ہے نگاہ گلشن میں
پھول ساغر، کلی گلابی ہے

۲۶ ’عہدِ طفلی‘ مخزن میں ص ۳۹-۳۸ پر شائع ہوئی اور گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۳-۱۱۲ پر موجود ہے۔ بانگ درا میں صرف دو بند شامل کیے گئے اور کچھ ترمیم ہوئی جس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال شروع میں بھی اس کی ہئیت سے مطمئن نہ رہے ہوں گے جس طرح ’ہمالہ‘ پر نظرِ ثانی کی ضرورت سمجھتے تھے مگر اُسے مخزن میں شائع ہونے دیا۔

۲۷ اس دور کی نظموں میں یہ تاثر صاف موجود ہے۔

۲۸ عبدالقادر نے یہ بات بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کی ہے۔

۲۹ بانگِ درا میں اشاعت کے وقت ’’پرِ مرغِ تصور‘‘ کی بجائے ’’پرِ مرغِ تخیل‘‘ کر دیا مگر لفظی ترمیمات کے سوا صرف ایک بند منسوخ کر کے اُس کی بجائے دوسرا بند لکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم کی بنیادی ہئیت سے اقبال کافی مطمئن رہے ہوں۔ نظم کے منسوخ اور متداول متون گیان چند ۱۹۸۸ء ص ۱۲۰-۱۱۹ پر موجود ہیں۔ نظم مخزن میں ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی جس کا حوالہ آگے آئے گا۔

۳۰ ’ہم نچوڑیں گے دامن‘ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۹-۱۱۸ پر اس وضاحت کے ساتھ موجود ہے، ’’باقیات [باقیاتِ اقبال] میں اس کا ماخذ کشمیری گزٹ ستمبر ۱۹۰۱ء درج ہے۔ شروع میں ایک نوٹ ہے کہ اقبال نے ایک دوست کی فرمائش پر یہ نظم آٹھ دس منٹ میں کہی تھی۔‘‘

۳۱ مثنوی عقدِ گوہر کے قطعاتِ تاریخ طبع گیان چند (۱۹۸۸) ص ۷۹-۷۷ پر موجود ہیں۔ مولف نے کسریٰ منہاس کے مضمون ’اقبال اور تاریخ گوئی‘ مطبوعہ نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۳۹۴ سے اقتباس دیا ہے، ’’قیاسِ واثق ہے کہ مصنف نے پہلے ۱۳۱۷ھ و ۱۹۰۰ء کو اس کتاب کی تاریخ کے لیے احباب کو لکھا ہو اور بعد میں ۱۳۱۸ھ اور ۱۹۰۱ء کے لیے۔ احباب نے دونوں سنین کہ کر بھیج دیے ہوں گے۔‘‘

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۳۲ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص ۲۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۳۳ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۲۵۰

۳۴ ایضاً

۳۵ محمد دین تاثیر کی روایت ہے۔ ممتاز اختر مرزا (۱۹۷۸) ص ۹۵

۳۶ یہ ملنے والے محمد دین تاثیر ہیں۔ ممتاز اختر مرزا (۱۹۷۸) ص ۹۵

۳۷ ''لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے'' کے سات اشعار بانگِ درا میں شامل ہیں۔ منسوخ اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۲۱-۱۲۰ پر مختلف مجموعوں سے حاصل کر کے رکھے گئے ہیں مگر نومبر ۱۹۰۱ء کا مخزن مولف کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

۳۸ 'ابرِ کہسار' ترمیم کے ساتھ بانگِ درا میں شامل ہے جہاں اس کے چار بند ہیں۔ منسوخ متن میں دس بند تھے جو گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۲۴-۱۲۱ پر موجود ہیں۔

۳۹ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۴۲ روایت ذکی شاہ

۴۰ حسن اختر، ڈاکٹر ملک (۱۹۸۸) ص ۱۵۱۔ مرتب نے بعض گمشدہ درسی کتب کی بازیافت سے اقبال کی چند نظموں خصوصاً 'ایک مکڑا اور مکھی' اور 'ہمدردی' کے اولین متون پر تحقیق کی ہے۔ نظم 'ہمدردی' کی مکمل ابتدائی صورت وہاں سے نقل کی جاتی ہے:

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
آنکھوں سے ٹپک رہے تھے آنسو
کہتا تھا کہ ہائے اب کروں کیا
کس طرح سے گھونسلے کو جاؤں
یہ شام یہ رات کا اندھیرا
پھیلی ہے یہ رات کی سیاہی
رستہ نہیں گھونسلے کا ملتا
افسوس مجھے سمجھ نہ آئی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اُڑنے چگنے میں دن گزارا
خورشید کے ڈوبنے سے پہلے
گھر مجھے چاہئیے تھا جانا
بچے مرے دیر سے ہیں بھوکے
دے گا انہیں کون جا کے دانا
مر جائیں نہ وہ غریب ڈر کر
گر جائیں نہ گھونسلے سے باہر
بلبل نے کہا جو حال اپنا
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دِیا بنایا
روشن ہیں جو پر مرے تو مجھ کو
آسان ہے راہ کا دکھانا
اوروں کے جو کام میں نہ آؤں
کس کام کا پھر مرا ہے جینا
بلبل کو اُڑا یہ کہہ کے جگنو
لے کر اُسے گھونسلے میں آیا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

۴۱ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص۳۳

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۴۲ اقبال کی متروک نظم 'دین و دنیا' (۱۹۰۲ء) کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۳ پر درج ہے، ''باقیات کے مختلف مجموعوں میں نوٹ کے مطابق جمسیٹ جی ایک پارسی تھا جس کا نیلام گھر اُس زمانے میں بہت مشہور تھا... جمسیٹ تخریب ہے جمشید کی۔ اقبال نے اِس لفظ میں 'ے' کو حذف کر کے جم+سٹ باندھا ہے۔'' اقبال کا شعر یہ ہے:

ایسے دینداروں سے تنگ آئے ہیں آخر کیا کریں
آج سنتے ہیں کہ جمسیٹ جی کے ہاں لیلام ہے

۴۳ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۴۴-۱۴۳ کے مطابق خدنگِ نظر لکھنؤ کے جنوری ۱۹۰۱ء کے شمارے میں نظم 'شمع و پروانہ' کے ساتھ ادارتی نوٹ میں درج تھا کہ اقبال نے یہ نظم ''ہمارے اصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے...'' اِس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ نظم چند ہفتے قبل لکھی ہوگی۔

۴۴ 'خفتگانِ خاک سے استفسار' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۴۷-۱۴۴ پر موجود ہے مگر مولف نے فروری ۱۹۰۱ء کا مخزن نہیں دیکھا۔ بانگِ درا میں شامل کرتے ہوئے نظم میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ جو اشعار نکالے گئے اُن میں پہلے بند کے کچھ اشعار شامل تھے جن میں جھٹپٹے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ایک کسان کا ذکر تھا جو کھیت سے کچھ گنگناتے ہوئے واپس آرہا تھا۔ اِن اشعار کو حذف کرنا بھی بظاہر اُسی اصول کا تابع دکھائی دیتا ہے جس کے تحت ''ہمالہ'' میں سے بدھ مت والے اشعار نکالے ہوں گے یعنی ایک عمومی کیفیت بیان کرتے ہوئے کسی مخصوص شے کی تفصیل میں جانے سے تاثیر میں کمی ہوسکتی ہے۔ اقبال کی ابتدائی شاعری میں اِس قسم کی جزئیات جنہیں بعد میں حذف کرنا پڑا میتھو آرنلڈ کا اثر ہو سکتی تھیں جس کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ وہ بہت "precise poet" ہے جبکہ اقبال طبعاً شاعری میں کسی قدر ابہام کے دلدادہ تھے جس کی وجہ سے گہرائی پیدا ہوتی ہے (یہ خیال انہوں نے اپنی نوٹ بک *Stray Reflections* میں ظاہر کیا ہے)۔

۴۵ 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۰-۱۵۴ پر موجود ہے۔ مولف نے عنوان کا آخری لفظ ''کو'' لکھا ہے لیکن میں نے ''سے''، وجہ یہ ہے کہ اختلافِ نسخ کے حصے میں ص ۳۸۱ پر مولف خود لکھتے ہیں، ''سرود و باقیات [سرودِ اقبال اور باقیاتِ اقبال] میں اِس نظم کا عنوان 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے' ہے جب کہ نوادر [نوادرِ اقبال] میں آخری 'سے' کے بجائے 'کو' ہے۔ نوادر میں انجمن کی روداد سے اس کے بارے میں جو اقتباس نقل کیا ہے اُس

میں بھی نظم کے نام میں 'کو'ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یوں عام طور سے سرود کا متن صحیح ہے اور نوادر میں اغلاطِ کتابت ہیں۔'' میں نے سرود کے متن پر اعتبار کیا کہ یہ محاورے کے اعتبار سے بہتر بھی معلوم ہوتا ہے۔

۴۶ گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۶۰ پر اِس شعر کے حوالے سے درج ہے، ''اقبال نے پہلی بار بانگِ درا کی ترکیب اِس نظم میں استعمال کی جو ۲۲ سال بعد اُن کے مجموعے کا عنوان بنی۔'' مجموعے کا عنوان بھی اور ایک خاص استعارہ بھی جو اِس کے بعد بار بار آتا رہا۔ اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں اپنا جو کردار متعین کیا تھا یہ اُس کی طرف اشارہ تھا۔

۴۷ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)

۴۸ شیخ اعجاز احمد جن کے مطابق شیخ نور محمد کسی زمانے میں احمدی جماعت سے منسلک ہوئے تھے اُن کا بیان ہے کہ اِس موقع پر تمام احمدی دوستوں نے جنازے میں شرکت سے معذرت کر لی بلکہ نور محمد سے بھی توقع کی گئی کہ وہ بیٹی کے جنازے میں شامل نہ ہوں مگر اُنہوں احمدی جماعت ہی سے تعلق ختم کر لیا اور حامد شاہ کے ذریعے کہلوا بھیجا، ''میں عمر رسیدہ ہوں۔ آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا۔'' (اعجاز احمد [۱۹۸۴] ص۱۸۵) دیگر خاندانی روایتیں اِس بات کی تردید کرتی ہیں کہ شیخ نور محمد کبھی احمدی جماعت سے منسلک ہوئے ہوں۔

۴۹ اِس بحث کے لیے دیکھیے گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۶۳، اور اعجاز احمد (۱۹۸۴) ۱۹۰

۵۰ 'خفتگانِ خاک سے استفسار' کے بارے میں گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۴۷ پر درج ہے، ''یہ نظم مخزن فروری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔''

۵۱ انجمن کے سترھویں جلسے میں لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر تعلیم تشریف لائے تھے۔ ان کے نام گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۴۹ پر درج ہیں۔

۵۲ عرفی شیرازی کا یہ شعر اقبال نے اپنے خطوط میں بھی درج کیا ہے اور اپنی شاعری میں اس کی طرف دو قسم کے اشارے کیے ہیں۔ ایک وہ جن میں یہی مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، 'رُوحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' (بالِ جبریل) میں رُوحِ ارضی آدم سے کہتی ہے:

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

دوسری قسم کے مقامات وہ ہیں جنہیں اِس شعر کے مضمون پر بحث سمجھا جاسکتا ہے یعنی اُن میں اِس شعر کا جواب دیا ہے یا اِس کے مضمون سے کوئی دُوسرا نکتہ نکالا ہے۔ مثلاً غزل (بانگِ درا) کا یہ شعر:

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

اِسی طرح 'خضرِ راہ' (بانگِ درا) میں خضر، شاعر سے کہتے ہیں:

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دُوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک!

۵۳ مدرسے کے طالب علم کا بھیک مانگنا نیز اگلا واقعہ جس میں مولوی صاحب انگریزی کے خلاف وعظ کر رہے تھے اقبال نے 'دین و دنیا' میں نظم کیے تھے جو بانگِ درا میں شامل نہیں ہوئی مگر باقیات کے مختلف مجموعوں کے علاوہ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۴-۱۴۹ پر موجود ہے۔ وہیں نوادرِ اقبال سے انجمن حمایتِ اسلام کی ۲۲ فروری کی روداد کا اقتباس نقل کیا گیا ہے جس کے مطابق نظم میں جن واقعات کا ذکر ہے وہ حقیقتاً پیش آئے تھے۔ واقعاتی نظمیں جو بانگِ درا میں شامل ہیں اُن میں سے اکثر کے بارے میں شہادتیں موجود ہیں کہ وہ حقیقت پر مبنی ہیں مثلاً 'زہد اور رندی'، 'موٹر' اور 'سیرِ فلک' وغیرہ۔

۵۴ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۲ پر مولف نے رائے دی ہے، ''سچ تو یہ ہے کہ یہ نظم اقبال کے مرتبے سے گری ہوئی ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں وہ 'نالہ یتیم' اور 'ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' جیسی نظمیں پڑھ چکے تھا۔ ۱۹۰۲ء میں دن کے جلسے میں گورنر کی قصیدہ خوانی اور رات کو ایسی تمسخرانہ نظم! اِس میں بھرتی کے الفاظ اور تصنع آمیز قافیے تک لانے پڑے۔'' شعری حسن کی حد تک رائے درست ہے مگر مولف نے یہ بات نظر انداز کر دی ہے کہ اقبال کے ذہنی سفر میں یہ ایک نئے موضوع کے تعاقب کا آغاز معلوم ہوتا ہے اور کسی نئے کام کا آغاز کمال سے نہیں بلکہ کسی ناپختگی سے ہوتا ہے۔ مینجمنٹ سائنس کا عام کلیہ ہے کہ کسی ایک طریقے کے مطابق کام کرتے کرتے اچانک اُس سے بہتر طریقِ کار کو اپنائیں تو کارکردگی کا معیار ایک دم بہتر ہونے کی بجائے پہلے عارضی طور پر گرتا ہے اور اُس کے بعد پہلے سے بہتر ہو جاتا ہے۔

۵۵ سالک (۱۹۵۵) میں ہے (جسے گیان چند ۱۹۸۸ء ص ۱۵۴-۱۵۳ پر بھی تبرکاتِ اقبال کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے)، ''چوں کہ اِس قطعہ میں بعض غلط قسم کے مولویوں کو کھری کھری سنائی تھیں اِس

(c) 2012 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

لیے مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) نے اِس قطعے کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اُس کے متعلق بھی ایک شعر میں اشارہ تھا... بعد میں 'محبوبانِ عالم' کی جگہ 'بیچارے حسینوں' کر دیا گیا۔'' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۴ پر مولف نے خیال ظاہر کیا ہے، ''اگر ایسا ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب اشعار ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کو پڑھے جانے والے متن میں نہیں ہوں گے بلکہ بعد کا اضافہ ہوں گے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صدیقی پریس میں طباعت سے متعلق اشعار بھی جلسے کے بعد بڑھائے گئے ہوں گے یا مطبوعہ قطعے میں الگ سے شامل کر کے سنائے گئے ہوں گے۔'' یہ اُن کا قیاس ہے، مجھے زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی پریس والے اشعار بھی جلدی سے کہ کر مطبوعہ میں شامل کر دیے گئے ہوں۔

۵۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۰-۱۵۹

۵۸ اِس غزل کے آٹھ شعر گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۷-۱۱۶ پر موجود ہیں۔ ماخذ فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) ہے اور زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند نے اِسے اندازے سے ۱۹۰۱ء کی غزلوں میں رکھا ہے لیکن میرے خیال میں یہ اور اِس سے اگلی غزل (''کسی کے ذکر کوسن کر تڑپ جانے کی باتیں ہیں'' اور ''یہ کس اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی باتیں ہیں'') ۱۹۰۲ء کے اوائل کی ہوسکتی ہیں جب اقبال بعض قسم کے واعظوں پر ناراض تھے۔ دونوں غزلوں میں مشقِ سخن کی پختگی ہے جسے گیان چند نے محسوس کیا ہوگا مگر ابھی تک واعظوں پر تنقید میں گہرائی نہیں آسکی جس کی وجہ سے اقبال نے 'دین ودنیا' والے ہنگامے کے فوراً بعد ان غزلوں کی اشاعت مناسب نہ سمجھی ہوگی۔

۵۹ 'دین ودنیا' کا شعر ہے:

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے زماں
اُن سے اُمّیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

اِس کے بارے میں گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۳ پر درج ہے، ''موچی دروازے میں اقبال کے دوست زُبدۃ الحکما حکیم غلام نبی مشہور طبیب تھے۔ تبرکات [تبرکاتِ اقبال مرتبہٗ محمد بشیر الحق دیسنوی، دہلی ۱۹۵۹ء] کے مطابق یہ اُنہیں پر چوٹ تھی۔ اقبال نے اسے غلط قرار دیا۔ نقوش لاہور نمبر میں ان کے حالات ص ۸۱۹ پر دیے ہیں۔ ان کی چالیس کے قریب تالیفات ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں انتقال ہوا۔''

۶۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۷ پر غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں لیکن میرے خیال میں ۱۹۰۲ء میں 'دین ودنیا' کے قریب کے زمانے کی ہوسکتی ہے (تفصیل پچھلے حاشیے میں ملاحظہ ہو)۔

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۶۱ اِس غزل کے تین اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۸-۱۱۷ پر موجود ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں، میں نے موقع کی مناسبت سے شعر استعمال کیا ہے۔

۶۲ ''دل کی بستی عجیب بستی ہے'' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۱ پر موجود ہے۔ بظاہر مخزن کا شمارہ مارچ ۱۹۰۲ء مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔

۶۳ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۳۸۱ پر وحید کی کتابیات اور اقبال دانائے راز کے حوالے سے درج ہے کہ ۱۹ مارچ ۱۹۰۲ء کو پنجۂ فولاد جلد ۲ نمبر ۱۱ میں اقبال کی نظم 'زبانِ حال' شائع ہوئی جو اُنہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کو پڑھی تھی۔ مولف کا خیال ہے، ''چونکہ اِس تاریخ کو انجمن کے اجلاس میں اقبال نے صرف یہی نظم پڑھی تھی اِس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پنجۂ فولاد میں اِسی کو 'زبانِ حال' کے نام سے چھاپا گیا ہوگا۔

۶۴ ''وہ وعظ اپنا کہے جائے ہوشیار ہوں میں'' والی غزل بانگِ درا میں شامل نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۷-۱۶۶ پر موجود ہے۔ اِس کا زمانہ معلوم نہیں مگر مولف کی رائے ہے، ''ابتدائی دَور کی معلوم ہوتی ہے۔'' ابتدائی دَور سے اُن کی مراد یورپ روانگی سے پہلے کا دَور ہے لیکن میرے خیال میں یہ غزل عین اِسی زمانے کی ہے جہاں مولف نے اِسے رکھا ہے یعنی ۱۹۰۲ء کیونکہ اِس میں عرصۂ تقریر تنگ ہونے کا ذکر ہے:

کبھی نہ گوشِ سماعت سے شرمسار ہُوں میں
وہ راز ہُوں کہ زمانے پہ آشکار ہُوں میں

یہ دُشواری اُسی زمانے میں 'اسلامیہ کالج کا خطاب...' سے شروع ہوتی نظر آتی ہے۔ واعظ پر پھبتی والا جو شعر میں نے کتاب میں نقل کیا اُس میں بھی متانت آ گئی ہے جس کی وجہ سے اِسے 'دین و دنیا' سے ذرا بعد کی سمجھا جا سکتا ہے۔

۶۵ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸) ص ۱۸۷

۶۶ دیکھیے اسی باب میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء۔

۶۷ دیباچہ علم الاقتصاد

۶۸ دیباچہ علم الاقتصاد

۶۹ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۴۳

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۷۰ بانگِ درا میں اِس غزل کے پانچ اشعار موجود ہیں۔ وہیں سے گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۱۸ پر رکھی گئی ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر مولف نے ''بانگِ درا میں اِس کے وقوع کی بنا پر'' اِسے ۱۹۰۱ء کی غزلوں میں جگہ دی ہے۔ میرے خیال میں یہ ۱۹۰۲ء میں 'دین و دنیا' سے شروع ہونے والی سوچ کے سلسلے میں پختگی آنے کا موقع ظاہر کرتی ہے، مثلاً:

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
عداوت ہے اُسے سارے جہاں سے

ایسی اچھی غزل کو اقبال نے مخزن میں شائع نہیں کروایا جس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ بلاوجہ جلتی پر مزید تیل نہ ڈالنا چاہتے ہوں گے کہ اُن کا مقصد مذہبی طبقے کو ناراض کرنا نہیں بلکہ اصلاح کرنا تھا۔

۷۱ شیخ عبدالقادر، 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء۔ مشمولہ اقبالیات کے سو سال بہ حوالہ اقبال جادو گرِ ہندی نژاد مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

۷۲ بانگِ درا میں اِس نظم کے صرف آخری حصے کا مکالمہ 'عقل و دل' کے عنوان سے شامل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۶۴-۱۶۱ پر نظم کا منسوخ متن موجود ہے۔ مولف نے لکھا ہے، ''نظم میں براہِ راست جوابیہ انداز نہیں''، مگر اِسے تو کسی نظم کی خامی نہیں بلکہ خوبی سمجھنا چاہیے۔ اُن کا یہ کہنا، ''اِس کے علاوہ نظم بالکل دولخت ہے'' کسی حد تک درست بھی ہے اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے مکالمے کو نظم کا حصہ تسلیم نہیں کیا۔ بہرحال پچھلے برس کی نظموں کی ہئیت میں پختگی کے بعد اچانک اِس قسم کا کچا پن اِسی بات کی دلیل ہے کہ اقبال کسی نئے خیال کے تعاقب میں نکلے تھے جسے کامیابی کے ساتھ بیان کرنے کے ذرائع ادبی روایت میں پہلے سے موجود نہیں تھے۔

۷۳ 'آفتابِ سحر' نظرِ ثانی کے بعد 'آفتابِ صبح' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۶۶-۱۶۴ پر موجود ہے۔

۷۴ 'صدائے درد' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن میں تین بند تھے اور اشعار کی تعداد ۴۹ تھی۔ یہ گیان چند (۱۹۸۸) ص۱۷۰-۱۶۷ پر موجود ہے۔ مولف کی رائے ہے، ''اشعار نمبر ۲۴ تا ۲۷ قابلِ توجہ ہیں جن میں صریحاً قوم کو مذہب پر ترجیح دی ہے'' (اِن میں کچھ یہاں اقتباس میں شامل کیے گئے ہیں) مگر لفظ قوم اُس زمانے میں کئی معانی میں استعمال ہوتا تھا جن میں قبیلہ، مذہب، نسل، پیشہ وغیرہ میں سے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ یہاں اِسے قبیلے کے معانی میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

انتہا پسند ہندوؤں کے مقابلے پر مسلمانوں کا دفاع ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے مذہب کی اہمیت اقبال اس سے پہلے کئی نظموں میں بیان کر چکے تھے۔

۷۵ یہ غزل بانگِ درا میں شامل نہیں کی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۱-۱۷۰ پر موجود ہے۔

۷۶ 'ماتمِ پسر' متروک نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۲-۱۷۱ پر موجود ہے جہاں مخزن میں شائع ہونے والے نوٹ کے خلاصے سے شانِ نزول بھی بیان ہوئی ہے۔

۷۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۳ پر 'خطِ منظوم (پیغامِ بیعت کے جواب میں)' کے بارے میں درج ہے، ''اسی عنوان سے پنجۂ فولاد لاہور ۱۴ جولائی ۱۹۰۲ء جلد ۲ شمارہ ۲۷ میں شائع ہوئی۔''

۷۸ مکتوب بنام مسز اسٹراٹن۔ نیز افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۶

۷۹ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۹۸

۸۰ عبدالمجید سالک (۱۹۵۴) ص ۶۸

باب ۸: سورج کے سامنے

۱ صدیق (کیٹلاگ) کے مطابق یہ کتاب اقبال کی ذاتی کتب کے مجموعے میں موجود تھی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۷ پر مولف نے لکھا ہے ''ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے مجھے اپنے مکتوب مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ء میں لکھا کہ اقبال نے میکس مولر کی تفسیر کا ترجمہ کیا ہے۔ میکس مولر نے سوریہ نارائن اُپنشد کا حوالہ دیا ہے جب کہ اس کا صحیح نام محض سوریہ اُپنشد ہے۔ اقبال نے نظم کے ساتھ لکھے ہوئے شذرات میں سوریہ نرائن اُپنشد لکھا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُن کا ماخذ میکس مولر ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظم میں بہت سے حشویات ہیں خصوصاً آخری تین شعر بالکل غیر ضروری ہیں۔''

۲ 'آفتاب' کو بانگِ درا (حصہ اول) میں شامل کرتے ہوئے ''تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے'' پر نظرِ ثانی کر کے ''تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے'' کر دیا گیا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۷-۱۷۲ پر منسوخ متن اور دیگر تفصیلات موجود ہیں۔

۳ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۴۳

۴ یہ غزل بانگِ درا میں موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر بانگِ درا میں اِسے ''نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی'' والی غزل سے پہلے رکھا ہے۔ وہ مخزن میں جون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی مگر گیان چند

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

(۱۹۸۸) ص ۱۸۵ پر مولف کا اندازہ ہے کہ یہ غزل اُس سے پہلے کی نہیں لگتی: ''اِس کی پختگی اِس عقیدے کی منافی ہے۔ یہ واضح ہو کہ بانگِ درا میں ہر جگہ کلام تاریخی ترتیب سے درج نہیں کیا گیا۔ ہوسکتا ہے اقبال نے اِس غزل کا نقشِ اول جون ۱۹۰۱ء میں یا اُس سے پہلے تیار کیا ہو۔ بعد میں اِسے ترقی دے کر موجودہ شکل دے دی۔ نقشِ اول موجود نہیں ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چار شعر انتخاب ہیں۔ پوری غزل میں زیادہ اشعار رہے ہوں گے۔ یہ اشعار سب سے پہلے کہاں شائع ہوئے، معلوم نہیں۔'' چونکہ مولف کو محمد انور خاں کی قلمی بیاض میں بھی یہی اشعار ملے تھے لہٰذا اُن کے خیال میں، ''کسی رسالے میں چھپے ضرور ہوں گے جہاں سے قلمی کلام کے مرتب نے نقل کیے'' مگر خود مولف کے بیان کے مطابق یہ بیاض ۱۹۲۴ء میں مرتب کی گئی (حرفِ اوّل، ص ۱۲) پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اشعار کسی رسالے سے نہیں بلکہ بانگِ درا ہی سے اُس میں نقل کیے گئے ہوں؟

۵ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸) ص ۱۹۱

۶ یہ منسوخ غزل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۱-۱۸۰ پر فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں اور مولف نے اندازے سے یہاں رکھی ہے۔ آخری شعر جو میں نے نقل کیا اُسی مضمون کا شعر زبورِ عجم (۱۹۲۷) حصہ اول کی غزل نما نظم کا آخری شعر ہے۔

۷ 'شکریۂ انگشتری' منسوخ نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۹-۱۷۷ پر نظم، خط اور دیگر تفصیلات موجود ہیں۔

۸ یہ ملنے والے محمد دین تاثیر ہیں۔ ممتاز گوہر مرزا (۱۹۷۸) ص ۹۶-۹۵۔ نظم 'شمع' کی شانِ نزول معلوم نہیں مگر زمانہ یہی ہے۔ نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شائع ہوئی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۳-۱۸۱ پر منسوخ متن مختلف مجموعوں کے حوالے سے موجود ہے مگر غالباً مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء کا شمارہ مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔

۹ 'ایک آرزو' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۵-۱۸۳ پر مختلف مجموعوں کے حوالے سے منسوخ متن موجود ہے مگر غالباً مخزن کا دسمبر ۱۹۰۲ء کا شمارہ مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔ نظرِ ثانی کے بارے میں اُن کی رائے ہے، ''بانگ میں چھاپتے وقت دُوسرا بند شاید اِس لیے حذف کیا گیا کہ اِس میں مختلف ملتوں کی ہم آہنگی پر زور دیا گیا جو اقبال کے بعد کے موقف کے منافی تھا۔'' مختلف قوموں اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی تو اقبال کے کسی دَور کے موقف کے بھی

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

منافی نہیں ہوسکتی نہ ہی بانگِ درا کی ترتیب کے وقت اقبال اپنے ذہنی سفر کے کسی مرحلے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے ورنہ بہت سی نظمیں سرے سے شامل ہی نہ کرتے۔ اِس نظم کے منسوخ اشعار پر نظر ڈالنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وجہ سے نظم کی وحدت مجروح ہو رہی تھی اور اختصار کی وہ خوبی بھی پیدا نہیں ہوتی تھی جو اقبال کو فطری طور پر مرغوب تھی مگر جسے ابتدائی دور میں وہ بعض اوقات اظہارِ مدعا کی خاطر نظر انداز کر جاتے تھے۔

۱۰ ''کہ اِس دیس میں راج ہے دشمنی کا'' والی غزل متروک ہے۔ اِس کے تین اشعار فقیر سید وحیدالدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۰ پر درج ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں مگر مجھے اقبال کی بعد کی بیاضوں میں نہیں ملی اس لیے سفرِ یورپ سے پہلے کی تصور کرتے ہوئے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ مولف کی یہ رائے محلِ نظر ہے، ''چونکہ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال وطن کے لیے نہیں لکھتے تھے اس لیے تیسرے شعر [''خدا جانے کیا ہوا ہندیوں کو...''] میں ہندیوں کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ سفرِ یورپ سے قبل کی ہے۔'' اقبال نے بعد میں ہندوستان کے بارے میں لکھا، مثلاً بانگِ درا کے حصہ سوئم میں ''ظریفانہ'' حصے کی غزل کا یہ شعر:

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اُردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

۱۰ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۹۔ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی

۱۱ ''عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنائی ہوا'' متروک غزل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۰-۱۷۹ پر موجود ہے۔

۱۲ 'سید کی لوحِ تربت' ترمیم کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۹-۱۸۷ پر موجود ہے۔

باب ۹: امیر کا صنم خانہ

۱ امیر بیگم کے حالات دیگر مآخذوں کے علاوہ جاوید اقبال (۱۹۸۱) اور افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) سے اخذ کیے گئے ہیں۔ دیگر مآخذوں کا حوالہ ان کی جگہ پر دیا گیا ہے۔

۲ عبداللہ قریشی ص (۱۹۸۸) ص ۵۵

۳ ''چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم'' والی غزل بانگِ درا میں شامل نہیں کی گئی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۱۹۰پر موجود ہے۔

۴ عبداللہ قریشی ص (۱۹۸۸) ص ۵۵

۵ بانگِ درا کے لیے نظرِ ثانی کرتے ہوئے دو شعر خارج کر دیے گئے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۹۱-۱۹۰پر موجود ہے۔

۶ اقبال نے منشی سراج الدین کے نام مکتوب ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء میں امیر بیگم کو اشارتاً 'علتِ ابرِ گہربار' لکھا۔ دیگر تفاصیل بھی انہی دنوں شروانی کے نام ایک خط میں بیان کیں جن میں امیر بیگم کا نام نہیں آتا چنانچہ بین السطور پڑھ کر میں نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں۔

۷ 'ابرِ گہربار' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۰-۱۹۱پر شامل ہے

۸ سالک (۱۹۵۵) ص ۲۴۶

۹ ''جسے دیکھتا ہوں وہی خوب رو ہے'' والی غزل بانگِ درا میں شامل نہیں۔ اِس کے آٹھ شعر گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۶ پر موجود ہیں۔ مولف نے ''اِس کے رنگ اور پختگی کی بنا پر'' اِسی زمانے میں رکھا ہے۔

۱۰ 'بلبل کی فریاد' کے نام سے ایک نظم مارچ ۱۹۰۲ء تک لکھی جا چکی تھی اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہی تھی جو نظرِ ثانی کے بعد 'پرندے کی فریاد' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ اِس عنوان سے یہ سب سے پہلے مخزن میں فروری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی جس کا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۳-۲۰۱پر موجود ہے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کے خط میں منشی سراج الدین کو 'بلبل کی فریاد' بھیجتے ہوئے اقبال نے اُس نظم کی جو خصوصیات بتائیں اُن کے بارے میں مولف کی رائے ہے، ''یہ بیان نظم 'پرندے کی فریاد' پر بالکل چسپاں ہوتا ہے۔'' مولف نے ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضمون 'علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں'، مجلّہ سیفیہ یادگارِ اقبال جلد ہفتم ۱۹۸۱-۱۹۸۰ کے حوالے سے لکھا ہے، ''یہ اٹھارویں صدی کے انگریزی شاعر ولیم کوپر کی نظم 'On a Goldfinch Starved to Death in His Cage' سے ماخوذ ہے۔'' بانگِ درا نے اقبال نے اِسے ماخوذ نہیں لکھا جس کی وجہ شائد یہی ہو کہ یہ نظم ولیم کوپر سے زیادہ مولانا روم سے قریب ہے اور مولانا روم کے فیض کا اعتراف اقبال بانگِ درا سے پہلے اسرار و رموز میں اس طرح کر چکے تھے کہ اس کا اطلاق بعد کے تمام مجموعوں پر ہوتا ہے۔ مولانا روم کی پرندے والی حکایت سے اِس نظم کے تعلق پر توجہ نہیں دی گئی حالانکہ اِس نظم میں مثنوی کے دوسرے شعر کا آزاد ترجمہ بھی موجود ہے۔ مثنوی میں بانسری فریاد کرتی ہے:

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

کز نیستاں تا مرا ببریده اند
از نفیرم مرد و زن نالیده اند

اقبال نے اِس کا آزاد ترجمہ یوں کیا ہے:

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اِسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دُکھے ہوئے دِلوں کی فریاد یہ صدا ہے

ظاہر ہے کہ مثنوی میں جو بانسری کی فریاد ہے وہی پرندے کی بھی ہے کیونکہ وہاں دونوں ایک ہی چیز کی علامتیں ہیں۔

۱۱ یہ اشعار متروک ہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۷-۲۰۶ پر فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے موجود ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں مگر مولف نے اِس کے رنگ کو دیکھ کر اِسے اِسی زمانے میں رکھا ہے۔

۱۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۷ پر اس غزل کے تین اشعار فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے درج ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں۔ مولف نے اِس کے رنگ کو دیکھتے ہوئے اِسے اِسی زمانے میں رکھا ہے۔

۱۳ مکتوب بنام منشی سراج الدین، ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء

۱۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت علی بخش

۱۵ ''لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے'' متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۳-۲۰۴ پر موجود ہے اور شانِ نزول مخزن کے نوٹ کے خلاصے کی صورت میں درج ہے۔

۱۶ ''تو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت'' والی غزل متروک ہے۔ اس کے سترہ اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۰ پر مختلف مجموعوں سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ مخزن مئی ۱۹۰۳ء مولف کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

۱۷ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۸۸

۱۸ 'اہلِ درد' متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۸ پر موجود ہے۔

۱۹ 'ماں کا خواب' اور متن کی تفصیل گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۳۷-۱۳۶ اور ۳۷۶-۳۷۵ پر موجود ہے۔

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

بانگِ درا سے پہلے عبدالرزاق کی کلیاتِ اقبال میں بھی شائع ہوئی لیکن اس کا متن بانگِ درا کے مطابق ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متروک اشعار جو روزگارِ فقیر اور باقیاتِ اقبال کے حوالے سے گیان چند نے شامل کیے ہیں، بانگِ درا سے پہلے ہی کسی مرحلے پر خارج ہو چکے تھے ورنہ عبدالرزاق کی کتاب میں بھی موجود ہوتے۔

۲۰ حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۶۵

۲۱ ''نادرِ کاکوروی نے دُور سے دیکھا مجھے'' والی غزل متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۰-۲۱۸ پر موجود ہے۔ یہ خدنگِ نظر لکھنؤ میں اگست ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی لہٰذا کچھ عرصہ قبل کہی گئی ہوگی۔

۲۲ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر، مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور (۱۹۹۰)، ص ۹۳ میں یہ تحریر شامل ہے مگر صرف سالِ اشاعت درج ہے، مہینہ اور ماخذ کا ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ صرف کسی ثانوی ماخذ سے حاصل کیا ہوا اقتباس ہو۔

۲۳ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۵۳ نیز گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۴

۲۴ حسن نظامی

۲۵ 'برگِ گل' متروک نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۵-۲۱۱ پر موجود ہے۔ وہاں وضاحت ہے، ''یہ نظم سب سے پہلے ہفتہ وار وطن لاہور بابت ۲۰ جولائی ۱۹۰۳ء میں 'مناجات' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ وہاں تمہیدی نوٹ ہے، 'مناجات از شیخ محمد اقبال صاحب ایک اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج جو حضرت محبوب الٰہی کے مزارِ مقدس پر خواجہ حسن نظامی نے با آوازِ بلند پڑھی۔''

۲۶ ''عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا'' والی غزل متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۸-۲۱۷ پر مختلف مجموعوں کے حوالے سے موجود ہے۔ مولف نے عبداللہ قریشی کی تصنیف اقبال معاصرین کی نظر میں کے حوالے سے لکھا ہے، ''۱۹۰۳ء میں اقبال اور اُن کے دوست غلام بھیک نیرنگ دونوں نے غزلیں کہیں۔ نیرنگ کی غزل ع یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا، پنجۂ فولاد ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔''

۲۷ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۵۲

۲۸ حسن نظامی (۱۹۹۰) ص ۶۹

۲۹ دیکھیے مکتوب ۱۳۱ اگست ۱۹۱۸ء

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۳۰ اقبال (۱۹۰۸ء) ص ۹۰۔ انگریزی میں بزمِ قدرت کے لیے ''ایکسٹرنل نیچر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

۳۱ 'انسان اور بزمِ قدرت' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۱-۲۲۰ پر موجود ہے۔ یہ مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۳۲ 'شیشہ ساعت کی ریگ' منسوخ نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۲-۲۲۱ پر موجود ہے۔ خدنگِ نظر لکھنؤ میں ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۳۳ 'دردِ عشق' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۳-۲۲۲ پر موجود ہے۔

۳۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت علی بخش

۳۵ ''کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے؟'' والی غزل بانگِ درا میں شامل ہے مگر کچھ اشعار منسوخ ہوئے۔ وہ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۴-۲۲۳ پر موجود ہیں۔

۳۶ 'عشق اور موت' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۶-۲۲۴ پر موجود ہے۔

۳۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۸

۳۸ حسن نظامی

۳۹ قصیدہ متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۰-۲۲۶ پر موجود ہے۔ مولف کی رائے ہے، ''اِس کا خاتمہ محلِ نظر ہے۔ خاتمے میں ممدوح کے لیے دعا یا حسنِ طلب ہونا چاہیے۔ اقبال نے اِس قصیدے کے آخری دو اشعار میں فخر و مباہات سے کام لیا ہے بالخصوص آخری شعر میں جولاف و گزاف ہے وہ قصیدے کے لیے مناسب خاتمہ نہیں۔'' مگر قصیدے میں اپنی خودداری کا پہلو نمایاں کرنے کی مثال عرفی نے بھی قائم کی تھی اور پھر یہ قصیدہ زبانی نہیں بلکہ رسالے میں اشاعت کے ذریعے پیش ہو رہا تھا جس کی وجہ سے مزید گنجایش پیدا ہوئی ہوگی۔ بہرحال وہ نئی قدریں دریافت کرنے کا زمانہ تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ قصیدے کی صنف مستثنیٰ رہتی۔

۴۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۹ پر ہے کہ قصیدۂ نواب بہاول پور ہفت روزہ وطن میں بھی شائع ہوا مگر مولف نے اخبار کی اشاعت کی تاریخ نہیں بتائی۔

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۴۱ ''کوئی اِس نام کا نہیں ملتا'' متروک غزل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۸ پر فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے موجود ہے۔

۴۲ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۷

۴۳ 'زہد اور رِندی' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۳-۲۳۱ پر موجود ہے۔

۴۴ 'پیامِ صبح' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۱-۲۳۰ پر موجود ہے۔

۴۵ سالک (۱۹۵۵) ص ۲۴۷۔ یہ معلوم نہیں کس زمانے کا مکالمہ ہے۔

۴۶ ''ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں'' والی غزل بانگِ درا میں شامل ہے۔ منسوخ اشعار سمیت پورا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۴ پر موجود ہے۔

۴۷ 'ترجمۂ ڈائک' منسوخ نظم ہے۔ گیان چند ص ۲۳۵-۲۳۴ پر موجود ہے مگر جنوری ۱۹۰۴ء کا مخزن مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔

۴۸ 'طفلِ شیر خوار' کی شانِ نزول خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۳۷ پر بیان ہوئی ہے۔ نظم بانگِ درا میں شامل ہے۔ نظرِ ثانی میں کئی اشعار منسوخ ہوئے۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۶-۲۳۵ پر ہے۔

۴۹ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۴

۵۰ 'رخصت اے بزمِ جہاں' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۸-۲۳۶ پر موجود ہے۔

۵۱ 'تصویرِ درد' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل کی گئی۔ جو بند یہاں شامل ہے اُس میں سے بعض اشعار نکالے گئے اور آخری شعر کی جگہ یہ نیا شعر شامل کیا گیا:

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۶-۲۳۹ پر موجود ہے۔

۵۲ اقبال کا بیان مئی ۱۹۰۴ء میں مخزن میں 'نالۂ فراق' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۲۵۰ پر موجود ہے۔

۵۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)

۵۴ اقبال کا بیان مئی ۱۹۰۴ء میں مخزن میں 'نالۂ فراق' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۰ پر موجود ہے۔

۵۵ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۸۸

۵۶ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۶

۵۷ جاوید اقبال (۱۹۷۹) ص ۹۹

۵۸ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸)

۵۹ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۲

۶۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۷

۶۱ ''مشہور زمانے میں ہے نام حالی'' والی رباعی متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۷ پر موجود ہے۔

۶۲ حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۱۸۳

۶۳ ایضاً

۶۴ 'ماہِ نو' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۸-۲۴۷ پر موجود ہے۔

۶۵ 'نالۂ فراق' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۸۰-۱۴۸ پر موجود ہے۔ شانِ نزول کے بارے میں اقبال کا بیان مئی ۱۹۰۴ء میں مخزن میں 'نالۂ فراق' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۰ پر بھی موجود ہے۔

۶۶ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۸

۶۷ ''کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے'' والی غزل انتخاب کی صورت میں بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۱-۲۵۰ پر موجود ہے۔

۶۸ 'چاند' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۲-۲۵۱ پر موجود ہے۔

۶۹ مکتوب ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

۷۰ 'ابر' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شائع ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۴-۲۵۲ پر جلیل قدوائی کے مضمون 'اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن' ہمایوں لاہور مئی ۱۹۵۰ مشمولہ علامہ اقبال کی چند غیر مدون تحریریں از رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵) کے حوالے سے موجود ہے۔

۷۱ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) میں شامل اقبال کا مضمون 'قومی زندگی'

۷۲ عطیہ فیضی (۱۹۶۷)، دیکھیے جریدہ *Dawn*, April 30, 1967

۷۳ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) میں شامل اقبال کا مضمون 'قومی زندگی'

۷۴ جلسے کا حال گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۶ پر محمد عمر (نور الٰہی) کے مضمون 'ہندوستاں ہمارا کی شانِ نزول' مشمولہ آج کل یکم جنوری ۱۹۴۶ء کے حوالے سے درج ہے۔

۷۵ 'ہمارا دیس' بانگِ درا (۱۹۲۴) میں 'ترانۂ ہندی' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ اِس کا اولین متن اُسے سمجھا جاسکتا ہے جو اقبال کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا رسالہ آج کل دہلی اقبال نمبر ۱۹۷۷ میں شائع ہوا۔ اُس پر ۱۰ اگست کی تاریخ ہے اور یہاں وہی متن گیان چند (۱۹۸۸) سے اخذ کر کے درج کیا گیا ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۰-۲۵۴ اور ۴۲۱-۴۲۰ پر نظم کا پرانا متن اور مختلف متون کے اختلافاتِ نسخ موجود ہیں۔

۷۶ یہ بات بھی گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۶ پر محمد عمر (نور الٰہی) کے بیان سے ماخوذ ہے۔

۷۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۷-۲۵۶ کے مطابق اقبال کے ہاتھ میں 'ترانۂ ہندی' کا عکس سب سے پہلے پہلے رسالہ آج کل دہلی اقبال نمبر ۱۹۷۷ میں شائع ہوا مگر اُس کا ماخذ معلوم نہیں۔

۷۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۶ پر درج ہے کہ 'ترانۂ ہندی' عنوان کے بغیر اتحاد میں ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء کو شائع ہوئی۔ شرر کے نوٹ کا اقتباس بھی درج ہے۔ اتحاد کا عکس مولف کی نظر سے گزرا تھا۔

۷۹ دلگداز اگست ۱۹۰۴ء سے 'ترانۂ ہندی' پر تنقید کا اقتباس گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۸ پر درج ہے۔ اِس رسالے کا عکس مولف کی نظر سے گزرا تھا۔

۸۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۸ پر زمانہ کے تمہیدی نوٹ کا اقتباس ڈاکٹر اکبر حیدری کے مضمون 'اقبال کا سفرِ لکھنؤ: حقیقت یا افسانہ' ہماری زبان ۱۵ مئی ۱۹۸۰ کے حوالے سے درج ہے۔ مولف نے زمانہ کے متن کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ مولف کے خیال میں اقبال نے یہ متن خود زمانہ کو بھیجا تھا اِس لیے

(c) 2014. Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِسے نظم کا اولین متن سمجھنا چاہیے جس میں بعد میں اقبال نے تبدیلیاں کیں۔ میرے خیال میں بغیر سند کے ایسا نہیں سمجھا جاسکتا۔ نظم نے یکدم ایسی مقبولیت حاصل کی تھی کہ اُس زمانے میں بہت سے اخبارات نے شائع کی ہوگی۔

۸۱ 'سرگزشتِ آدم' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۵-۲۶۳ پر موجود ہے۔ مولف کا بیان ہے، ''امیر مینائی کے دیوان صنم خانۂ عشق میں اِس نظم کی زمین میں کوئی غزل یا شعر نہیں ہے۔''

۸۲ 'بلال' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۳-۲۶۱ پر منسوخ متن موجود ہے۔

۸۳ یہ غزل متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۸-۲۶۷ پر منسوخ متن موجود ہے اور ص ۴۲۴ پر اختلافِ نسخ کے ضمن میں لکھا ہے کہ الکاشف میں اِس کے سترہ شعر شائع ہوئے تھے جن کی ترتیب وہی تھی جو باقیاتِ اقبال طبع سوم میں ہے۔ مولف نے یہ نہیں بتایا کہ الکاشف اُن کی نظر سے گزرایا نہیں۔ مولف نے بقیہ تین اشعار فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) سے لیے ہیں۔

۸۴ مزید ایک لفظ اور عنوان کی تبدیلی سب سے پہلے بانگِ درا (۱۹۲۴) میں سامنے آئی۔

۸۵ یہ شعر بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل نہیں ہوا مگر غزل کا انتخاب شامل ہوا جس کا پہلا مصرع ''انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں'' مشہور ہے۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۱-۲۶۰ پر موجود ہے۔ مولف نے لکھا ہے یہ دکن ریویو جلد ۲ نمبر ۸ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی مگر شمارے کی تاریخ نہیں لکھی۔

۸۶ مکتوب ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۴ء

۸۷ تنقید ہمدرد کے مضمون کا اقتباس گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۰ پر موجود ہے۔

۸۸ شورش کاشمیری (نورتن) ص ۳۵، روایت عبدالمجید سالک۔ روایت نقل کرنے میں شورش سے کہیں غلطی ضرور ہوئی ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ عبدالمجید سالک نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ خود بھی گرامی کے ساتھ امیر کو لینے گئے تھے۔ یہ درست نہیں ہوسکتا کیونکہ ۱۹۰۴ء میں سالک کی عمر گیارہ برس تھی جبکہ اقبال سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۱۴ء کے قریب ہوئی۔ یہ واقعہ بعد کے زمانے کا بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو اقبال اور امیر کا تعلق ۱۹۰۴ء میں ختم ہوگیا تھا، دوسرے خود اسی روایت میں سالک کہتے ہیں کہ

(c) 2014 Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اقبال اُن دنوں بازارِ حکیماں میں رہتے تھے۔ یہ معلوم ہے کہ اقبال ۱۹۰۵ء کے بعد کبھی اُس محلے میں نہیں رہے۔

۸۹ ''آسمانوں میں زمینوں میں'' والی غزل بانگِ درا (۱۹۲۴) میں انتخاب کی صورت میں شائع ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۷-۲۶۶ پر موجود ہے۔ مولف نے عماد الملک سید حسین بلگرامی کے ذخیرے سے حاصل کی ہوئی ایک قلمی بیاض کے بارے میں لکھا ہے، ''بیاضِ عماد میں اِس غزل کے اوپر لکھا ہے: 'عنوان در صوفی' 'شاہ راہِ کامیابی'۔ معلوم ہوا کہ یہ غزل پنڈی بہاالدین کے رسالہ صوفی میں شائع ہوئی۔ ممکن ہے اِس کی پہلی اشاعت یہی ہو۔''

۹۰ 'موجِ دریا' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل کی گئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۹-۲۶۸ پر موجود ہے۔

۹۱ 'جگنو' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۱-۲۷۰ پر موجود ہے۔

۹۲ 'صبح کا ستارہ' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۲-۲۷۱ پر موجود ہے۔

۹۳ عبدالواحد معینی (۱۹۶۶/۱۹۵۲) ص ۱۹۵-۱۹۲ میں مخزن، جنوری ۱۹۰۵ء کے حوالے سے درج ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) میں نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً کے پیشِ نظر صرف اقبال کا اردو کلام تھا۔ پوری منقبت درجِ ذیل ہے۔ مخزن میں 'سپاسِ جنابِ امیرؑ' کے عنوان سے شیخ عبدالقادر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اقبال اسے صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں:

اے محوِ ثنائے تو زباں ہا
اے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت
اے نوحِ سفینۂ محبت
اے ماحیِ نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِّ خطِ وجوب و امکاں

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے
اے سینۂ تُو امینِ رازے
اے سرِّ نبوتِ محمدؐ
اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ
گردوں کہ بہ رفعت ایستادست
از بامِ بلندِ تو فتادست
ہر ذرّۂ در گہت چو منصور
در جوشِ ترانۂ اناالطّور
بے تو نتواں باو رسیدن
بے او نتواں بتو رسیدن
فردوس زتو چمن در آغوش
از شانِ تُو حیرت آئنہ پوش
جانم بغلامیٔ تُو خوشتر
سر بر زدہ ام زجیبِ قنبرؓ
ہشیارم و مستِ بادۂ تُو
چوں سایہ زپا فتادۂ تُو
از ہوش شدم مگر بہوشم
گوئی کہ نصیری خموشم
دانم کہ ادب بضبطِ راز است
در پردۂ خامشی نیاز است
امّا چہ کنم مئے تولا
تُند است بروں فتد زمینہا
زاندیشۂ عاقبت رہیدم

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

جنسِ غمِ آلِ تُو خریدم

فکرم چو بہ جستجو قدم زد
در دیر شد و درِ حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم
دامان چو گردباد چیدم
در آبلہ خارہا خلیدہ
صد لالہ تہِ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بروے کارم
شرمندۂ دامنِ غبارم
پویاں پئے خضر سوئے منزل
بر دوش خیال بستہ محمل
جویائے مے و شکستہ جامے
چوں صبح بباد چیدہ دامے
پیچیدہ بخود چو موجِ دریا
آوارہ چو گردبادِ صحرا
واماندہ زدردِ نارسیدن
در آبلۂ شکستہ دامن
عشقِ تُو دلم ربود ناگاہ
از کارِ گرہ کشود ناگاہ
آگاہ زہستی و عدم ساخت
بت خانۂ عقل را حرم ساخت
چوں برق بخرمنم گزر کرد
از لذّتِ سوختن خبر کرد
برباد متاعِ ہستیم داد

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

جامے زمئے حقیقتم داد
سرمست شدم زپا فتادم
چوں عکس زخود جدا فتادم
پیراہنِ ما و من دریدم
چوں اشک زچشمِ خود چکیدم
خاکم بفراز عرش بردی
زاں راز کہ با دلم سپردی
واصل بکنار کشتیم شد
طوفانِ جمالِ زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم
پروائے ملامتے ندارم
از جلوۂ عام بے نیازم
سوزم۔ گریم۔ تپم۔ گدازم

۹۴ دیکھیے حاشیہ۱

۹۵ یہ غزل انتخاب کی صورت میں بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ پہلا مصرع ہے، ''سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں''۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۳-۲۷۲ پر موجود ہے۔

۹۶ شورش کاشمیری (اُس بازار میں) ص ۱۸۴

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

منتخب کتابیات

☆ صرف انہی کتابوں کا اندراج کیا جا رہا ہے جن کا حوالہ مآخذ میں دیا گیا ہے۔ دیگر کتب جن سے اس سوانح کی تیاری میں مدد لی گئی وہ شامل نہیں۔

☆ مصنف کا نام درج کرتے ہوئے لقب، عہدہ یا ذات نکال کر اس کے بعد والے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ اگر نام کا پہلا لفظ محمد ہے تو اسے بھی نام سے پہلے شمار نہیں کیا گیا۔ مثلاً عبدالمجید سالک تو عبدالمجید سالک ہی رہا ہے مگر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو "عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد" لکھا ہے۔

☆ مصنف کے نام کے بعد کتاب کی پہلی اشاعت کا سال درج ہے۔ چونکہ اُردو میں تاریخِ اشاعت درج کرنے کا رواج عام نہیں رہا اس لیے بعض صورتوں میں دیباچے کی تاریخ کو طبعِ اوّل کی تاریخ فرض کرنا پڑا ہے۔

☆ ناشر کا نام کتاب کے اُس نسخے سے لیا گیا ہے جس سے براہِ راست استفادہ ہوا۔ اگر یہ پہلا ایڈیشن نہ رہا ہو تو ناشر کے نام کے بعد قوسین میں نئے ایڈیشن کی تاریخ درج ہے۔

کتبِ اقبال

The Development of Metaphysics in Persia (1908). Bazm-eIqbal (1964) Lahore.

علم الاقتصاد (۱۹۰۴)۔ آئینۂ ادب (۱۹۹۱) لاہور

بانگِ درا (۱۹۲۴ء)

اقبال کی وہ تحریریں جو دوسروں نے مرتب کیں

گیان چند، ڈاکٹر۔ ۱۹۸۸۔ ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال۔ شائستہ پبلشنگ ہاؤس۔ کراچی

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

مظفر حسین برنی۔۱۹۹۲۔ کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول)۔اُردو اکادمی۔دہلی

محمد عبداللہ قریشی۔۱۹۸۷۔حیاتِ جاوداں۔بزمِ اقبال۔لاہور

عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی۔۱۹۶۶/۱۹۵۲۔ باقیاتِ اقبال (طبع دوم)۔آئینۂ ادب۔لاہور

عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی۔۱۹۶۳۔مقالاتِ اقبال۔آئینۂ ادب (۱۹۸۸)۔لاہور

B. A. Dar 1967 *Letters And Writings Of Iqbal*. Iqbal Academy Pakistan, Lahore

Javid Iqbal, Dr. (1962/2006), *Stray Reflections*, Revised and annotated by Khurram Ali Shafique. Iqbal Academy Pakistan, Lahore

بنیادی ماٰخذ

اعجاز احمد۔۱۹۸۵۔مظلوم اقبال۔اعجاز احمد۔کراچی

امجد سلیم علوی۔۱۹۸۸۔اقبالیات از مولانا غلام رسول مہر۔مہر سنز۔لاہور

حمید احمد خاں۔۱۹۷۴۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری۔بزمِ اقبال (۱۹۸۳ء)۔لاہور

خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) بزمِ اقبال (۱۹۸۳)لاہور

عبدالقادر، شیخ۔۱۹۲۴۔دیباچہ بانگِ درا۔شیخ غلام علی اینڈ سنز (۱۹۷۳)۔لاہور

فقیر سیّد وحیدالدین۔۱۹۵۰/۱۹۶۳۔روزگارِ فقیر (جلد اوّل)۔آتش فشاں پبلی کیشنز: (۱۹۸۸)۔لاہور

فقیر سید وحیدالدین۔۱۹۶۳ء۔روزگارِ فقیر (جلد دوم)۔آتش فشاں پبلی کیشنز: (۱۹۸۸)۔لاہور

عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد۔۱۹۷۷۔روایاتِ اقبال۔اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۸۹)۔لاہور

عبداللہ قریشی (مرتب)۔۱۹۸۸۔تذکارِ اقبال از منشی محمد الدین فوق۔بزمِ اقبال۔لاہور

عبدالمجید سالک۔۱۹۵۵۔ذکرِ اقبال۔بزمِ اقبال۔لاہور

عبدالمجید سالک۔۱۹۵۴۔ سرگزشت۔الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب (۱۹۹۳)۔لاہور

محمد حنیف شاہد۔۱۹۷۲۔نذرِ اقبال، سر عبدالقادر کے مضامین، مقالات، مقدمات اور مکاتیب کا مجموعہ۔ بزمِ اقبال۔لاہور

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ممتاز اختر مرزا۔۱۹۷۸۔ مقالاتِ تاثیر۔مجلس ترقی ادب۔لاہور

نذیر نیازی،سیّد۔۱۹۶۱۔ اقبال کے حضور۔اقبال اکادمی۔کراچی

Atiya Fyzee (1947). *Iqbal*

Muhammad Siddique: *Descriptive Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library.* Iqbal Academy, Lahore

B. A. Dar (1967): *Writings And Speeches of Iqbal.* Iqbal Academy Pakistan, Lahore

جرائد

Dawn: April 21, 1952 (Attiya Faizi: When soft music confused Iqbal)

Dawn: April 30, 1967 (Attiya Faizi: Iqbal, a reflection)

اقبال (بزمِ اقبال لاہور) اکتوبر ۱۹۵۷ء: غلام بھیک نیرنگ 'اقبال کے بعض حالات'

ثانوی مآخذ

عبداللہ قریشی۔۱۹۸۲۔حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں۔بزمِ اقبال۔لاہور

افتخار احمد صدیقی۔۱۹۸۷۔ عروجِ اقبال۔بزمِ اقبال۔لاہور

سلطان محمود حسین،ڈاکٹر سیّد۔۱۹۸۶۔ اقبال کی ابتدائی زندگی۔اقبال اکادمی پاکستان۔لاہور

سلطان محمود حسین،ڈاکٹر سیّد۔۱۹۸۱۔ علّامہ اقبال کے اُستاد شمس العلماء مولوی سیّد میر حسنؒ (حیات و افکار)۔اقبال اکادمی پاکستان۔لاہور

نذیر نیازی،سیّد۔۱۹۷۹۔دانائے راز۔اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۸۸)۔لاہور

اجمل خان نیازی،ڈاکٹر۔۱۹۹۰ء۔فوق الکشمیر۔مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

الطاف علی بریلوی بی اے(علیگ)،سیّد اور پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے(مرتبین)۔۱۹۷۰۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ۔اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔کراچی

اکرام،ایس۔ایم۔(تاریخ ندارد)۔ یادگارِ شبلی۔اِدارۂ ثقافتِ اِسلامیہ(۱۹۹۴)۔لاہور

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی۔۱۹۸۳۔ اوزانِ اقبال۔شیخ غلام علی اینڈ سنز۔لاہور
جیلانی کامران۔۱۹۷۷۔اقبال اور ہمارا عہد۔مکتبہ عالیہ۔لاہور
حسن اختر، ڈاکٹر ملک۔۱۹۸۸۔ اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ۔یونیورسل بکس۔لاہور
سعید اختر درّانی۔۱۹۸۵۔ اقبال یورپ میں۔اقبال اکادمی۔لاہور
ظ۔انصاری۔۱۹۸۳۔مثنویاتِ غالب: اصل فارسی مع اردو ترجمہ۔غالب انسٹی ٹیوٹ۔نئی دہلی۔
شبلی نعمانی۔سفرنامہ مصرو روم وشام
بشیر فاروق۔۱۹۹۳۔ دانائے راز۔فاروق اکیڈمی۔کراچی
عبدالرؤف عروج۔۱۹۸۸۔رجالِ اقبال۔نفیس اکیڈمی۔کراچی
شورش کاشمیری(تاریخ ندارد)۔ اُس بازار میں۔الفیصل تاجرانِ کتب۔لاہور
شورش کاشمیری(تاریخ ندارد)۔ نو رتن۔الفیصل تاجرانِ کتب(۱۹۹۸)۔لاہور

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اِقبال۲

تشکیلی دَور: ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۱ء تک

خرم علی شفیق

سوانحِ اقبال کے سلسلے کی دوسری کڑی جس میں یورپ کے تعلیمی سفر، واپسی اور 'شکوہ'، 'شمع اور شاعر' اور 'جوابِ شکوہ' جیسی شہرۂ آفاق نظموں کی تخلیق کے مراحل کے ساتھ ساتھ بعض اقبال کی سوانح کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو پہلے کبھی سامنے نہیں آئے تھے۔

اقبال اکادمی پاکستان

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)

اقبال

چھ جلدوں میں مکمل سوانح حیات

۱

ابتدائی دور: ۱۹۰۴ تک

۲

تشکیلی دور: ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۳

۳

وسطی دور، ۱۹۱۴ سے ۱۹۲۲

۴

دورِ عروج: ۱۹۲۳ سے ۱۹۳۰

۵

اختتامی دور: ۱۹۳۱ سے ۱۹۳۸

۶

فکرِ اقبال ۱۹۳۸ کے بعد

اقبال اکادمی پاکستان

(c) 2014, Iqbal Academy Pakistan (www.allamaiqbal.com)